سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان ۷۷

مشاہدات

کابل و یاغستان

از

مولوی محمد علی قصوری
ایم - اے کینٹب

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو (پاکستان)

اردو روڈ۔ کراچی ۱

سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان نمبر ۲۷۷

مشاہدات

کابل و یاغستان

مصنفہ

مولوی محمد علی قصوری

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو، پاکستان

اردو روڈ، کراچی ۱

(زیر انتظام حامد علی ندوی)

انجمن پریس
لارنس روڈ۔ کراچی

نقشه

کابل و یاغستان

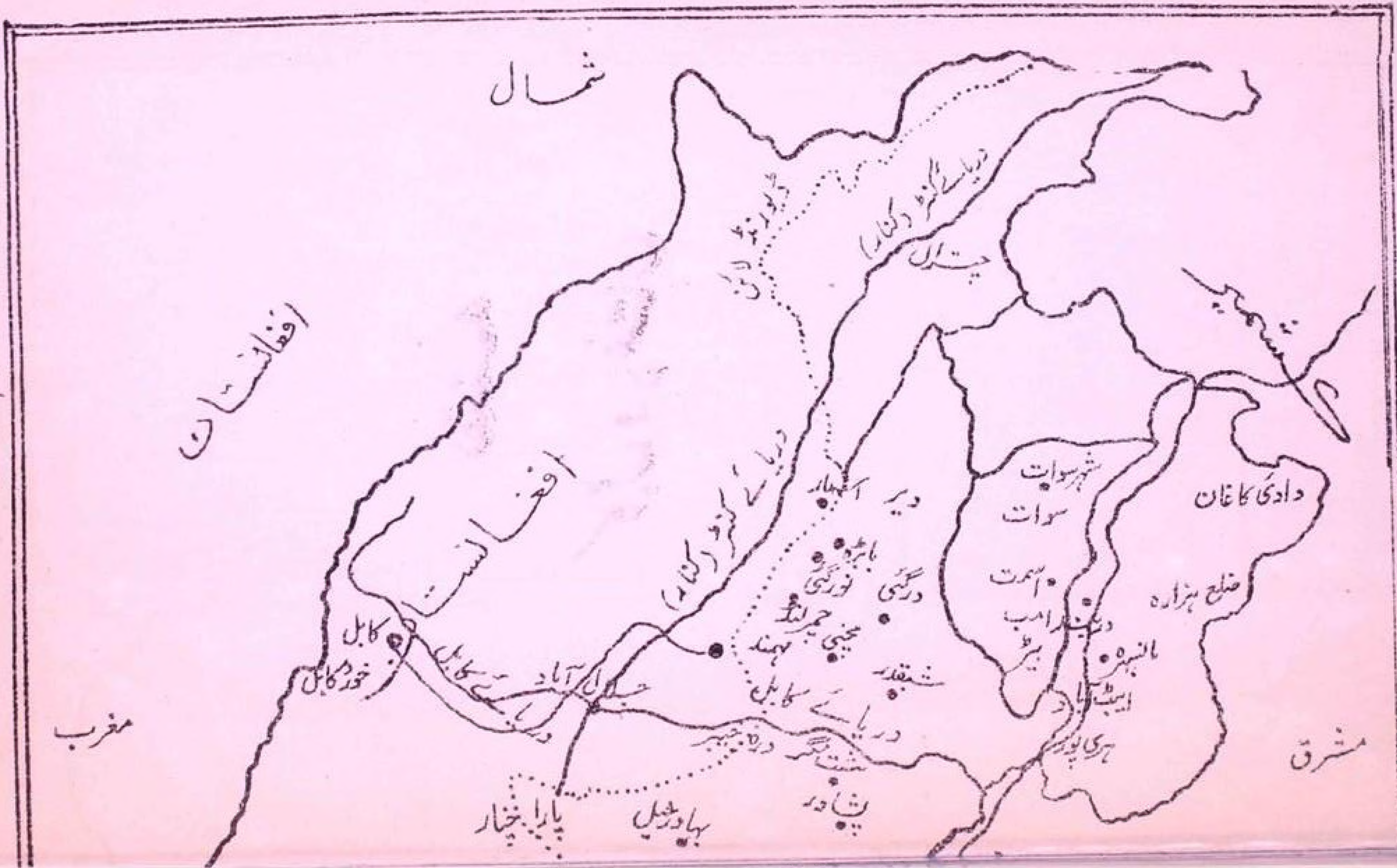
شمال
افغانستان
افغانستان
مغرب
مشرق
کابل
خورد کابل
جلال آباد
دریائے کابل
دریائے کنر (کنار)
دریائے کنر (کنار)
ڈیورنڈ لائن
چترال
کشمیر
دیر
اسمار
باجوڑ
نورگئی
درگئی
چمرکنڈ
مچنی
مہمند
شبقدر
دریائے کابل
درہ خیبر
لنڈی کوتل
پشاور
بہادر خیل
پارا چنار
شہر سوات
سوات
اسمت
دربند امب
بونیر
مانسہرہ
ایبٹ آباد
ہری پور
وادی کاغان
ضلع ہزارہ

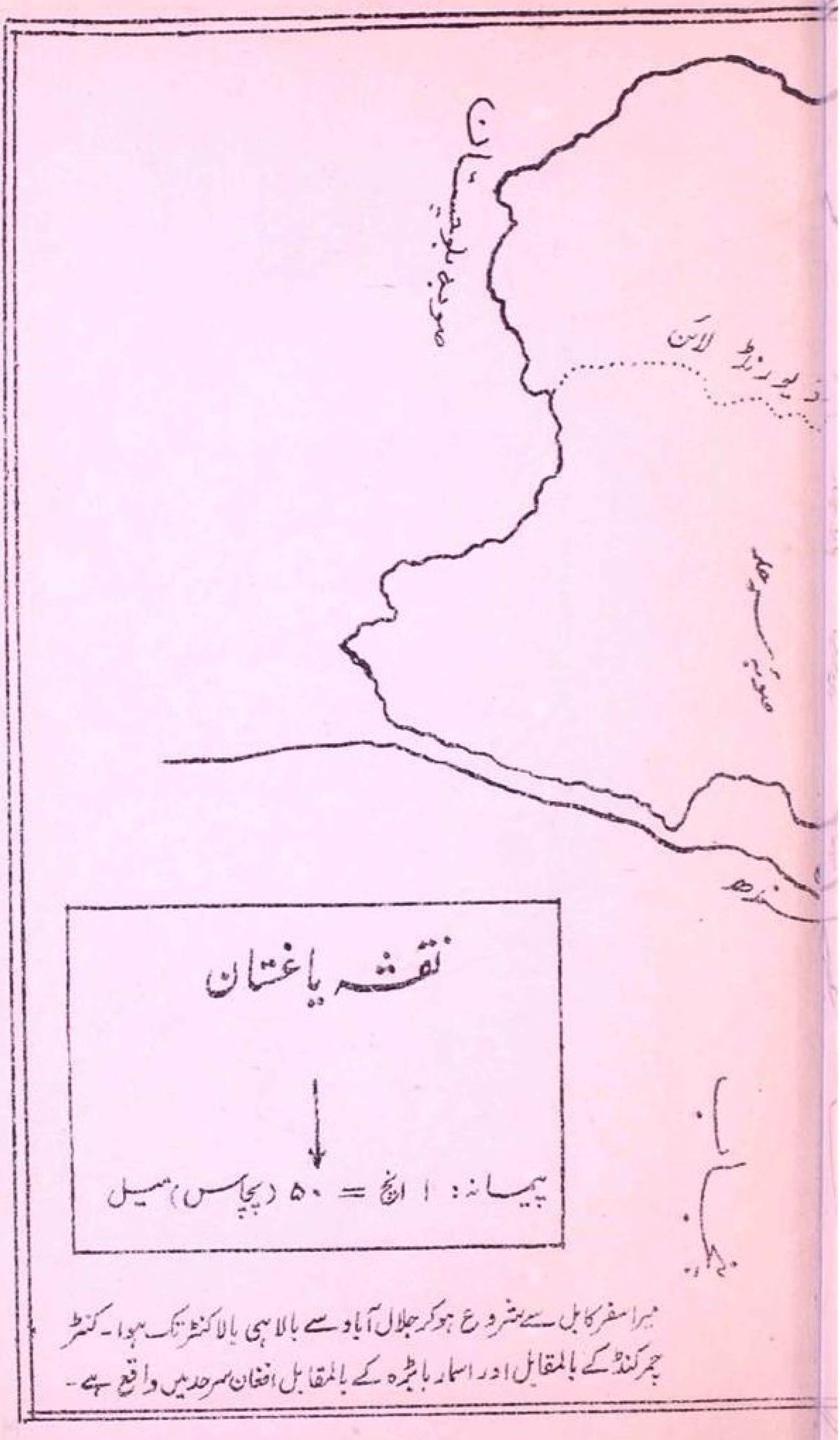
صوبہ بلوچستان
ڈیورنڈ لائن
صوبہ سرحد
نقشہ یاغستان
پیمانہ: ۱ انچ = ۵۰ (پچاس) میل
میرا سفر کابل سے شروع ہو کر جلال آباد سے بالا ہی بالا کنڑ تک ہوا۔ کنڑ چمرکنڈ کے بالمقابل اور اسمار باجڑہ کے بالمقابل افغان سرحد میں واقع ہے۔

پیش لفظ

ہماری درخواست پر مولوی محمد علی قصوری نے جو کوئی چالیس برس پہلے کابل و یاغستان تشریف لے گئے تھے اپنے دل چسپ مشاہدات تحریر فرمائے تھے جو رسالہ "تاریخ و سیاسیات" میں بالاقساط شائع کیے گئے تھے۔ اب ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ حکومتِ کابل کے موجودہ طرزِ عمل نے اہل پاکستان کو متحیّر اور حیران کر رکھا ہے شائد اس کتاب کے مطالعے سے اُن امور پر روشنی پڑ سکے جن سے یہ حیرانی و تحیّر جاتا ہے۔

عبد الحق

فہرست مضامین

۱۔ تمہید ۹

۲۔ افغانستان کا تعلیمی نظام ۱۲

۳۔ افغانستان کا نظامِ حکومت ۲۰

۴۔ کابل کے بعد ۳۷

۵۔ قبائل کی تنظیم ۵۰

۶۔ انگریزوں کا سفید جھوٹ ۷۹

۷۔ بیعت کا سوال ۹۶

۸۔ شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک اور امیر نعمت اللہ کا طرزِ عمل ۱۰۳

۹۔ جماعتِ مجاہدین اور اسلامی تحریکوں کے اصلی دشمن ۱۱۷

۱۰۔ بیرونی ممالک سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش ۱۲۶

۱۱۔ روس کو مشن اور سندھ کمیٹی کا دورہ ۱۲۹

۱۲۔ ڈپٹی برکت علی کا تعارف اور سر جارج روس کیپل کی تحریک پر ہندستان کو واپسی۔ ۱۴۰

تمہید

۱۹۱۱ء کا زمانہ بھی عجیب زمانہ تھا۔ شمالی افریقہ کے تمام ممالک ایک ایک کر کے مغربی استعمار کی نذر ہو چکے تھے۔ طرابلس پر اٹلی نے اچانک حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے مصر پر اپنے تسلط کا اعلان کرتے ہوئے ترکی فوجوں کو طرابلس کی مدد کے لئے جانے سے روک دیا۔ ہندوستان کے مسلمان جواب تک خواب غفلت میں مبتلا تھے کروٹیں سی بدلنے لگے۔ برطانوی ملوکیت پر ان کا اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ یہ دن تھے جب میں نے انگلستان کے لئے رخت سفر باندھا۔ میرے دل میں بھی اس زمانے کے نوجوانوں کی طرح ایک ہیجان برپا تھا۔ انگلستان پہنچا تو اچھی طرح آنکھیں کھلیں۔ اور پہلی مرتبہ یہ یقین ہوا کہ برطانیہ کی تمام سیاست اسلام دشمنی کے لئے وقف ہو گئی ہے۔ اور مصر کے بعد ایران، ترکی اور افغانستان کی باری ہے چنانچہ روس نے برطانیہ کے ساتھ خفیہ سازش ایران اور افغانستان کی تقسیم کے لئے کی۔ جس میں برطانیہ نے جنوبی ایران کے تیل کے چشموں کے معاوضوں میں روس کو شمالی ایران پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔ روس برطانیہ کی طرح سیاست کے میدان میں بری طرح ناکام ہوا اور اس نے اپنی ناکامی چھپانے کے لئے ایران پر فوج کشی کی اور وہ تمام

مظالم جن سے روسی تاریخ کے صفحات خونیں ہیں توڑے گئے۔ مسجدیں بے حرمت کی گئیں بوڑھے اور بچے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور قرونِ مظلمہ کا نقشہ دنیا کے سامنے ایک دفعہ پھر آگیا۔

انگلستان کی حکومت نے روس کی اِس دہشت پسندی سے بیزاری کا اظہار کیا لیکن درپردہ وہ پوری پوری تائید کرتی رہی۔ نہ صرف یہ بلکہ دوسرے اسلامی ممالک کو تباہ و برباد کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے یونان، بلغاریہ اور دوسرے ممالک سے مل کر ترکی کے حصے بخرے کرنے کے لئے ایک پورا منصوبہ تیار کر لیا ۱۹۱۲ء میں یہ سازشیں رنگ لائیں اور جنگ بلقان کے شعلوں نے ترکی حکومت کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے لیا مسلمانانِ ہندوستان جنھیں ترکی سے گہری وابستگی تھی۔ اب بیدار ہوئے اور نوجوان طبقے نے برطانوی استعمار کے خلاف آواز اٹھانی شروع کی۔ اتنے میں ہندوستان میں کانپور مسجد کا واقعہ رونما ہوا اور مولانا محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن کا ایک وفد ولایت پہنچا۔ میں اس وقت مسلم ایسوسی ایشن کیمبرج کا صدر تھا۔ میرے دل میں اس وقت کئی جذبات پرورش پا رہے تھے۔ برطانوی استعمار سے نفرت کا جذبہ تھا دوسرا مسلمانانِ عالم کی زبوں حالی کا احساس تھا۔ تیسرا جذبہ اس یقین پر مبنی تھا کہ مسلمانوں کی تباہی کی وجہ اُن کی کتاب اور سنت سے بُعد اور مجبوری ہے۔ اس عرصہ میں ہندوستان میں مولانا آزاد نے الہلال میں انہی جذبات کی ترجمانی شروع کی اور اپنی آتش بیانی سے مسلمانوں میں ایک آگ سی لگا دی مجھ پر جوہر کی رفاقت اور ابوالکلام کی خطابت نے بہت گہرا اثر کیا۔ اور میرے دل میں یہ عزم پیدا ہو گیا کہ مجھے برطانوی استعمار سے جنگ کے لئے زندگی وقف کر دینی چاہیئے۔ اسی سلسلے میں مختلف منصوبے بناتا اور ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں سے تبادلہ خیالات کرتا رہا۔

۱۹۱۴ء کی جولائی میں ہندوستان واپس ہوا۔ اس کے ایک ہی مہینے بعد پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی اور مجھے اس میں اپنی امیدوں کے پورا ہونے کی جھلک نظر آنے لگی۔ مجھے برطانوی حکومت کی طرف سے کئی ملازمتوں کی پیش کش ہوئی لیکن میرے دماغ میں تو ایک یہی سودا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلامی ممالک کو مغربی استعمار کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔ میں دلی پہنچا اور وہاں مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم، مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم اور بعض ممتاز ہندو لیڈروں سے تبادلۂ خیالات کا اتفاق ہوا۔ اس عرصہ میں خفیہ اطلاع ملی کہ انگریز روس کی حمایت سے اب افغانستان پر بھی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے سب لیڈروں کی متفقہ رائے ہوئی کہ میں افغانستان چلا جاؤں اور افغان حکومت کو اس خطرہ سے خبردار کر کے ہندوستان پر حملہ کیلئے تیار کروں۔ چنانچہ ایک سرسری تحریک کے بعد اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے مجھے حبیبیہ کالج کے پرنسپل کے طور پر رکھ لیا اور میں مارچ ۱۹۱۵ء میں کابل روانہ ہو گیا۔ کابل کے متعلق میری معلومات بہت سطحی تھیں۔ انگریزی کتابوں اور تزکِ امیر عبدالرحمٰن پر مبنی تھیں۔ اپنے ذہن میں افغانستان کو کافی ترقی یافتہ ملک سمجھتا تھا اور شہر کابل کو قسطنطنیہ اور قاہرہ کا ہم پلہ خیال کرتا تھا میں نے افغان دوستوں سے بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس غلط خیالی میں مبتلا رہا۔ یہاں تک کہ کابل پہنچ کر وہ تمام ہوائی قلعے ہباءً منثوراً ہو گئے اور معلوم ہوا کہ تزکِ امیری اور افغان دوستوں کے بیان میں زیادہ تر شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا گیا تھا۔ ورنہ افغانستان تعلیمی لحاظ سے نہایت پست اور وہاں کی حکومت بے حد رجعت پسند اور خود غرض قسم کی حکومت تھی۔

جب میں حبیبیہ کالج پہنچا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ ایک ادنیٰ اسکول سے بھی بدتر تھا۔ نہ وہاں کوئی نصابِ تعلیم تھا نہ جماعتوں کی حدبندی تھی۔ طرفہ تر یہ کہ اسکول میں کوئی مقررہ ذریعہ تعلیم نہ تھا اگر ایک استاد بچوں کو انگریزی میں

تعلیم دیتا تو دوسرا فارسی میں اور تیسرا اُردو میں۔ کوئی نصاب تعلیم نہ تھا بلکہ ہر جماعت کی تعلیم اس جماعت کے اُستاد کی مرضی پر منحصر تھی۔

افغانستان کا تعلیمی نظام

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کے تعلیمی نظام کے متعلق بھی کچھ عرض کیا جائے۔ میں نے افغانستان کے متعلق ایک عجیب بات محسوس کی اور وہ یہ کہ اس وقت افغانستان نے ہندوستان کی نقل میں اپنے اداروں کے بڑے بڑے پرشکوہ نام تو رکھ لئے تھے۔ لیکن وہ الفاظ ہی تک محدود تھے ان کی عملی حیثیت اسم بے مسمیٰ سے زیادہ تھی۔ مثلاً حبیبیہ کالج کہ اس کی حقیقت ایک ہائی اسکول سے بھی کم تر تھی۔ "نظارۃ المعارف" یعنی سنڈیکیٹ مگر اس کی حیثیت ایک گاؤں کی پنچایت سے زیادہ نہ تھی۔ معین السلطنت صاحب یعنی ولی عہد سردار عنایت اللہ خاں وزیر تعلیمات بھی تھے اور "نظارۃ المعارف" کے صدر بھی۔ اس کے سکرٹری کو ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن (ناظم تعلیمات) کہا جاتا تھا۔ مگر ناظم کے اختیارات ایسے تھے کہ وہ ایک کاغذ کا دستہ بھی نہیں خرید سکتے تھے۔ نظارۃ المعارف کے اراکین کی تعداد معین نہ تھی اور جس شخص کو بھی معین السلطنت صاحب چاہتے تھے۔ بلا لیا جاتا تھا لیکن تمام اراکین معین السلطنت صاحب کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا اور کچھ نہ کرتے تھے۔ مجلس کے فیصلے بھی اعلیٰ حضرت امیر صاحب کی منظوری کے بغیر نافذ نہ ہو سکتے تھے اور بسا اوقات اعلیٰ حضرت کی منظوری میں چھ چھ مہینے لگ جاتے تھے

میں نے جاتے ہی تمام صورت حالات کا جائزہ لیا اور معین السلطنت صاحب کی تائید سے اس نظام کی اصلاح شروع کی سب سے پہلے تو میں نے یہ فیصلہ کیا اور کالج میں فارسی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا اور میٹرک تک کا نصاب تجویز کر کے باقاعدہ جماعت بندی شروع کی۔ اس میں بعض ہندوستانی اساتذہ نے میری مخالفت کی لیکن بعض نے میری تائید کی اور معین السلطنت صاحب نے اپنے ایک حکم خصوصی سے اسے نافذ کر دیا۔

کالج کا سائنس ڈیپارٹمنٹ خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ جب میں نے اس کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک لاکھ سے زائد روپیہ اس پر خرچ ہو چکا ہے لیکن اس کی حالت ایک ادنیٰ اسکول کے دار لتجربہ سے بہتر نہ تھی۔ مجھے وہاں جاکر پہلی دفعہ احساس ہوا کہ مسلمان حکومتوں میں مسلمان عہدہ دار بہ استثناء چند کس درجہ خود غرض اور خائن واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے ٹرکی اور ایران کے متعلق پڑھا تھا اور افغانستان میں جاکر بچشم خود دیکھ لیا۔ مثال کے طور پر ایک معمولی فریکشن مشین Friction Machine (جس سے رگڑ کے ذریعہ بجلی پیدا کی جاتی ہے) کے لئے افغان حکومت کو گیارہ سو روپیہ ادا کرنا پڑا تھا حالانکہ اس کی قیمت اس وقت پندرہ روپیہ سے زیادہ نہ تھی۔ یہی حالت کتب خانہ کی تھی۔ معمولی معمولی ناولوں کی قیمت بیس بیس پچیس پچیس روپیہ لگائی گئی تھی۔ غرض مجھے اس امر کا بخنۃ یقین ہو تا گیا کہ اسلامی حکومتیں اپنے عمال کی رشوت ستانی کا شکار ہو رہی ہیں ایک اور معمولی سا واقعہ پیش کرتا ہوں میں نے نظارۃ المعارف میں اسکول کی عمارت کی توسیع کی تجویز پیش کی اور دو کمروں کے اضافہ کی منظوری لی۔ اتفاق سے معین السلطنت صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ان دو کمروں کی لاگت کیا ہوگی میں نے عرض کیا کہ بمشکل تین ہزار روپیہ۔ خیر وہ تجویز منظور ہو کر محکمہ تعمیر میں گئی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب انھوں نے ستاسی ہزار کا تخمینہ بنا کر بغرض سفارش میرے پاس بھیج دیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہو گیا جب معاملہ نظارۃ المعارف میں پیش ہوا مجھے اپنے تخمینہ کی صحت پر اصرار تھا اور ارکانِ مجلس کو سرکاری تخمینہ پر۔ آخر معین السلطنت صاحب نے مجھکو حکم دیا کہ تم بنوا دو ورنہ تمہارے خلاف انضباطی کارروائی کی جائے گی۔ بھلا ایک پرنسپل کو اپنے تعلیمی مشاغل سے اتنی فرصت کہاں مل سکتی ہے کہ اپنی نگرانی میں دو کمرے تعمیر کروائے لیکن کابل میں سب کچھ ممکن تھا چنانچہ میں نے وہ دونوں کمرے بنوائے اور ان کی لاگت صرف تئیس سو (۲۳۰۰)

روپیہ ہوئی۔ معین السلطنت صاحب کو اس پر اس قدر سخت غصہ آیا کہ انہوں نے چیف انجینیر سے جو انگریز تھا جواب طلبی کی یہ کابل کے مقیم انگریزی عملے سے میری دشمنی کی ابتدا تھی۔

یہاں بطور جملہ معترضہ میں افغانستان کے انگریز ملازمین کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ میرے پاکستانی بھائی ان سطور کو بغور پڑھیں گے۔ کسی اسلامی حکومت کا یہ خیال کرنا کہ اس کا کوئی انگریز ملازم اس کا ملازم ہے۔ فاش غلطی ہے۔ انگریز خواہ وہ پاکستان میں ہو خواہ افغانستان میں خواہ ٹرکی میں ہو۔ خواہ ایران میں۔ خواہ مصر میں ہو خواہ افریقہ میں کبھی بھی اپنے تئیں کسی غیر حکومت کا ملازم نہیں سمجھے گا بلکہ وہ اپنے تئیں برطانیہ کا ہی ملازم خیال کرے گا اور اس کے تمام اعمال برطانوی حکمت عملی کے مطابق ہوں گے۔ افغانستان میں اس وقت بہت سے انگریز ملازم تھے جن کو علاوہ بیش قرار تنخواہوں کے نہایت عالی شان کوٹھیاں، سواری، نوکر چاکر، بجلی، پانی سب مفت ملتا تھا مگر ان میں سے ہر ایک اپنے تئیں کنگ جارج کا نمایندہ سمجھتا تھا اور گو افغانستان میں اعلیٰ حضرت امیر صاحب کے علاوہ علیا حضرت ملکہ حضرت عالی نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں حضرت عالی معین السلطنت سردار عنایت اللہ خاں صاحب اور دوسرے امراء و وزرا کے احکام چلتے تھے۔ لیکن ایک انگریز ملازم کے لئے سوائے اعلیٰ حضرت کے اور کسی کا حکم واجب الاطاعت نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ دوسرے حکام کو اتنی جرأت نہ تھی کہ کسی انگریز افسر کو کوئی حکم دے سکے۔ ان انگریزوں میں سے ایک افسر تو "مشین خانہ" یعنی اسلحہ سازی کے کارخانہ کا ناظم تھا۔ اس کی تنخواہ غالباً چار ہزار روپیہ ماہوار (انگریزی سکہ) تھی۔ اس کے ماتحت تین چار انگریز بڑی تنخواہوں پر مقرر تھے۔ اسی طرح تعمیرات کا محکمہ بھی ایک انگریز کے تابع تھا۔ اس کو بھی غالباً پونے تین ہزار روپیہ تنخواہ ملتی تھی

کوٹھی سواری وغیرہ اس کے علاوہ۔ اس شخص سے مجھے چونکہ پالا پڑا اس لئے اس کی قابلیت کا اندازہ کرنے کا خوب موقع ملا۔ یہ شخص جیسا کہ اس کا اپنا بیان تھا بمبئی کی کسی یورپین فرم کا "سیلزمین" تھا اور انجنیری سے اس کی واقفیت صرف اتنی تھی کہ اس کارخانے کے عمارتی سامان کا انچارج تھا۔ اس نے افغان حکومت کے حکم سے ایک لاسلکی اسٹیشن کی تعمیر شروع کی تھی جس پر میرے پہنچنے تک پانچ لاکھ روپیہ صرف ہو چکا تھا۔ چونکہ میں نے بھی کیمبرج میں سر جے جے تامپسن کی شاگردی میں لاسلکی سے واقفیت حاصل کر لی تھی اس لئے مجھے بڑی حیرت ہوئی جب میں نے سنا کہ پانچ لاکھ روپیہ کے صرف کے بعد بھی وہ آلہ بیکار تھا۔ چنانچہ جب دو کمروں کی تعمیر کے تخمینہ کے متعلق جھگڑا ہوا جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں، تو معین السلطنت صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں لاسلکی اسٹیشن کا بھی معائنہ کروں اور اس کے اخراجات کو پڑتال لوں۔ پہلے تو انگریز افسر نے مجھے اپنے دفتر میں داخل ہونے یا لاسلکی اسٹیشن میں گھسنے کی اجازت ہی نہیں دی لیکن خیر کافی ردوکد کے بعد وہ رضامند ہو گیا۔ مجھے پڑتال کرنے پر معلوم ہوا کہ لاسلکی اسٹیشن ابھی ابتدائی مرحلہ میں تھا اور اس کے آلات نشر و ایصال دونوں ناقص تھے۔ معین السلطنت صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً اس کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ جب اس نے انکار کیا تو انھوں نے سپاہی مقرر کر کے اسے زبردستی سرحد پار کر دیا۔ اس نے ہندوستان پہنچ کر گورنمنٹ آف انڈیا میں افغان گورنمنٹ کے خلاف شکایات کی اور میرے خلاف خوب زہر اگلا۔ اب اس کے بعد تمام انگریزی عملہ اور برطانوی گماشتے مجھے اپنا سخت ترین دشمن تصور کرنے لگے۔ اس انگریز کے معاملے نے بہت طول کھینچا اور اعلیٰ حضرت نے معین السلطنت صاحب سے جواب طلبی کی اور اس انگریز افسر کو چھ ماہ کی تنخواہ اور کرایہ دے کر معاملہ رفع دفع کیا۔

میں نے یہ سب واقعات ذرا تفصیل سے لکھے ہیں کیونکہ ان کا آئندہ واقعات

سے بہت تعلق ہے۔ انگریز انجینئر کے آنے کے بعد معین السلطنت صاحب نے مجھے اس کی کوٹھی رہنے کے لیے عنایت کی۔ اب کابل میں دو کیمپ بن گئے۔ تمام انگریز میرے دشمن ہو گئے اور انھوں نے میرے قتل کی سازش کی۔ چنانچہ ایک رات ایک انگریز نے جب کہ میں اپنے باغ میں ٹہل رہا تھا پیچھے سے ایک لاٹھی کا ایک ایسا وار کیا میں لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ نوکر آواز سنتے ہی دوڑے اور وہ انگریز بھاگ گیا۔ اب دشمنی ظاہر ہو گئی۔ چند دن بعد جب میری طبیعت ٹھیک ہو گئی تو میں نے اس معاملے کو پورے زور سے معین السلطنت صاحب اور نائب السلطنت کی خدمت میں پیش کیا اور ایک مفصل عریضہ انگریزوں کی اسلام دشمنی پر ملاحظے میں گزرانا۔ اس کے بعد میرے قتل کی کئی سازشیں کی گئیں۔ یہ واضح رہے کہ اس زمانہ میں اور شاید اب بھی افغانستان میں کسی شخص کا قتل کروانا ایک معمولی بات تھی بالخصوص انگریزی حکومت کے لیے جس نے افغانستان کے اکثر عمال کو خرید رکھا تھا۔ میں اگر ان تمام سازشوں کا پول کھولوں جن کا مجھے افغانستان میں عینی مشاہدہ ہوا تو شاید لوگ یہ سمجھیں کہ میں انگریز دشمنی میں مبالغہ کر رہا ہوں لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ کسی مسلمان حکومت کے لیے انگریز ملازمین سے صلاح و فلاح کی توقع رکھنا کبریت احمر کی تلاش سے کم نہیں ہے۔

آمدیم بر سر مطلب۔ اب میں پھر تعلیم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ تعلیمی اصلاح کا بیڑا تو میں نے اٹھا لیا لیکن عملاً ہر میدان میں مایوسیوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے سرسری سا نصاب تعلیم بنا کر اسکول میں جاری کیا تو معلوم ہوا کہ سوائے ایک یا دو اساتذہ کے کوئی استاد بھی اس نصاب کو پڑھا نہ سکتا تھا بالخصوص انگریزی حساب جغرافیہ سائنس تو ان کی دسترس سے بالکل باہر تھے کیونکہ دو کے سوا باقی تمام اساتذہ ہندستانی اسکولوں کے میٹرک پاس تھے۔ وہ سب خوشامد کی روٹی کھاتے تھے یعنی کوئی تو معین السلطنت صاحب کے ساتھ جا کر ٹینس کھیلتا تھا کوئی اعلیٰ حضرت کی سیر و تفریح

کے موقعوں پر مٹھائیاں اور کھانے تیار کرتا تھا۔ بعض گا نا سنا کر محفل کی رونق بڑھاتے تھے اور اس طرح سے اپنے قیام کو افغانستان میں ناگزیر بنا رہے تھے۔ کئی صاحب اسکول سے کئی کئی گھنٹے غیر حاضر رہتے اور پوچھنے پر یہ جواب دیتے کہ میں فلاں سردار کی حاضری میں تھا۔ اس لئے جب میں نے اوقات اور نصاب کی تعین شروع کی تو انھوں نے آکر کہا کہ آپ کیوں ایسے ملک کے لئے دردسر مول لیتے ہیں جہاں گھوڑا گدھا ایک ہی ترازو میں تولے جاتے ہیں۔ آپ کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اِس کم عمری میں ایسی بیش قرار تنخواہ ملے جو افغانستان کے سپہ سالار کی تنخواہ کے برابر ہے اِس لئے چند سال میں روپیہ جمع کرکے آرام سے ہندوستان جاکر بیٹھ جانا۔ جب یہ تدبیر نہ چلی تو وہ مجھ سے بگڑ گئے۔ بالآخر انھوں نے معین السلطنت سے میری شکایت کی اور کہا یہ شخص فارسی بالکل نہیں جانتا اور نہ فارسی میں ریاضی اور سائنس کی تعلیم دے سکتا ہے۔ چنانچہ سردار صاحب ایک دن اچانک (نادر شاہ شہید جو اس وقت سپہ سالار اعظم تھے) کو لیکر اسکول کے معائنہ کے لئے تشریف لے آئے ہیں اتفاقاً اس وقت دسویں جماعت کو ریاضی کا سبق دے رہا تھا وہ سیدھے میری جماعت میں آگئے۔ میں بدستور پڑھانے میں مشغول رہا وہ بہت توجہ سے سنتے رہے جب درس ختم ہوا تو سپہ سالار صاحب نے مہرِ سکوت کو توڑا اور عرض کیا کہ حضرت عالی کیا میں آپ سے نہیں کہتا تھا کہ مولوی محمد علی کے خلاف سب شکایات حسد پر مبنی ہیں۔ چنانچہ معین السلطنت صاحب نے حکم دیا کہ تمام اسٹاف اور عملہ کو اسکول کے میدان میں جمع کیا جائے ہم ان کے سامنے تقریر کریں گے ان کی تقریر کا خلاصہ درج ذیل ہے:۔

> ہم سے بعض بدباطن لوگوں نے مولوی محمد علی کے خلاف بہت سی شکایات کی تھیں اس لئے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم اور سپہ سالار صاحب اور دوسرے اراکین نظامت مولوی محمد علی کے کام کا جائزہ لیں

چنانچہ ہم مولوی محمد علی کے تدریس کے طریقہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے
ان کی فارسی دانی نے ہم پر خاص اثر کیا۔ اب ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ
تمام استاد مولوی محمد علی مذکور کے طریق تعلیم کی پیروی کریں ورنہ اُن کو
فوراً موقوف کر دیا جائیگا۔"

اِس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ معین السلطنت نے مجھے اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہ نادر شہید نے مجھے اپنے گھر پہ بلا کر اپنے والد محترم سردار محمد یوسف خاں اور عم محترم سردار محمد آصف خاں کی خدمت میں پیش کیا اور ان سے ذکر کیا کہ کس طرح بعض ہندوستانی استاد اور تمام انگریز ملازمین میرے دشمن ہو گئے ہیں اس پر سردار محمد یوسف خاں مرحوم مغفور اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے بغل گیر ہو کر فرمایا کہ تو میرا بیٹا ہے اور آج سے میرے گھر میں تیرا وہی مرتبہ ہوگا جو نادر خاں ہاشم خاں اور شاہ محمود خاں کا ہے اور تم اب کابل میں اپنے تئیں تنہا مت سمجھنا بلکہ میں اور میرا تمام خاندان تمہارے ساتھ ہیں" میں یہ ضرور کہوں گا سردار صاحب نے ایک سچے مسلمان کی طرح اس عہد کو نبھایا اور ان کے تمام صاحبزادوں نے بھی مجھ سے برادرانہ سلوک کیا چنانچہ شاہ نادر شہید سردار ہاشم خاں اور سردار شاہ ولی خاں نے بمبئی میں بھی میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر اپنی قدیم برادر نوازی کا ثبوت دیا۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ شاہ شہید کا خاندان اُس وقت افغانستان میں ان چند مستثنیات میں سے تھا جو دل سے افغانستان اور اسلام کے بہی خواہ تھے۔

اس واقعہ کے تین چار دن بعد اعلیٰ حضرت کا فرمان موصول ہوا کہ میں شرف باریابی کیلئے گالف کے میدان میں حاضر ہو جاؤں اور معین السلطنت صاحب مجھے اعلیٰ حضرت ہمایوں کی خدمت میں پیش کریں گے۔ وقت مقررہ پر سردار صاحب مجھے لیکر گالف کے میدان میں پہنچ گئے وہاں بہت سے درباری جمع تھے۔ ان سے میرا رسمی تعارف

کروایا گیا۔ تھوڑے عرصہ بعد حضرت عالی نائب السلطنت سردار نصراللہ خاں تشریف لائے۔ سردار نصراللہ خاں اپنی انگریز دشمنی کے باعث مشہور تھے۔ میانہ قد ابھرا ہوا جسم روشن آنکھیں۔ کشادہ پیشانی نہایت متین اور سنجیدہ چہرہ ان کے عزم کا پتہ دیتا تھا۔ مجھ سے سلام کے بعد ہاتھ ملاکر فوراً ہندوستان کے سیاسی حالات کے متعلق سوالات شروع کر دیئے۔ ابھی اس گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ خود اعلیٰ حضرت کی رولز رویس آموجود ہوئی۔ اعلیٰ حضرت کے ساتھ ان کے دونوں مصاحبان خاص یعنی سردار آصف خاں و سردار یوسف خاں اور سردار محمد نادر شاہ سپہ سالار اعظم اور سردار ہاشم خاں اور سردار شاہ ولی خاں تھے۔ نائب السلطنت صاحب اعلیٰ حضرت کو لیکر گالف کے میدان میں داخل ہوئے اور درباریوں سے علیک سلیک کرتے ہوئے سیدھے میری طرف تشریف لائے اور مجھ سے میری تعلیم کے متعلق سوالات کئے۔ اعلیٰ حضرت میانہ قد اور نسبتاً فربہ اندام تھے نہایت عمدہ لندن کا سلا ہوا سوٹ اور سیاہ قراقلی ٹوپی زیب سر تھی۔ مزاج میں تواضع اور انکسار نمایاں تھا۔ مجھ سے اس قدر شفقت سے پیش آئے کہ مجھے ذرا بھی اجنبیت محسوس نہ ہوئی اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اسلامی اخوت کا رشتہ کس قدر مضبوط ہے کہ شاہ و گدا کو ایک جگہ کھڑا کر دیتا ہے۔ اعلیٰ حضرت مجھ سے زیادہ تر کیمبرج۔ لندن۔ پیرس اور برلن یونیورسٹی کے متعلق پوچھتے رہے۔ پھر ریاضی کے متعلق پوچھا اس کے بعد مجھے گالف کھیلنے کی دعوت دی۔ چنانچہ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان کے ساتھ گالف کھیلتا رہا۔ کھیل کے خاتمہ پر اعلیٰ حضرت نے از راہِ الطاف شاہانہ فرمایا کہ تم گالف بہت اچھی کھیلتے ہو کبھی کبھی ہمارے ہاں حاضر ہو جایا کرو۔ اس کے بعد اعلیٰ حضرت تشریف لے گئے۔

مجھے میرے دوستوں نے مبارک باد دی کہ تمہارے قدم اب کابل میں جم گئے۔ لیکن معاندین کی سرگرمیاں جاری رہیں۔ چنانچہ بعض نے اعلیٰ حضرت سے جاکر

شکایت کی کہ میں لڑکوں کو وہابی بنانا چاہتا ہوں اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ میں نے اسکول میں قرآن شریف کا ترجمہ لازمی قرار دیا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے ایک فرمانِ خصوصی کے ذریعہ سے حکم دے دیا کہ پورا نصاب تعلیم مرتب کرکے بغرض منظوری حضور میں پیش کیا جائے۔

افغانستان کا نظامِ حکومت

یہاں مناسب ہوگا کہ افغانستان کے نظامِ حکومت پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

واضح رہے کہ میں اس نظام کا نقشہ پیش کروں گا۔ جسے میں نے اس وقت برای العین دیکھا ممکن ہے کہ موجودہ نظامِ حکومت میں اصلاح ہو چکی ہو۔ جب میں نے افغانستان کا قصد کیا تو میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہاں کا نظامِ حکومت شخصی یا استبدادی ہے لیکن میرا خیال تھا کہ بہرحال افغانستان ایک باقاعدہ منظم سلطنت ہوگی۔ چنانچہ اپنے افغان دوستوں سے کابل کے نظم ونسق کی داستانیں اور عدل بادشاہی کی حکایتیں سن کر میں یہ خیال کرتا تھا کہ افغان حکومت ایک عادلانہ بادشاہی نظام کا نمونہ ہوگی۔ لیکن وہاں جا کر ایک عجیب تصویر سامنے آئی۔ افغانستان میں یوں تو امیر صاحب مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت سے حکمراں تھے۔ قانون و قواعد صرف ان کی مرضی تھی۔ بظاہر ایک قاضی القضاۃ بھی تھے جو شرعی احکام کے نافذ سمجھے جاتے تھے۔ مگر ان کی اصل حیثیت اعلیٰ حضرت کی مرضی کے مطابق شریعت اسلامی کی توجیہ وتنفیذ کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھی اعلیٰ حضرت کے ذاتی مشاغل میں مداخلت تو کیا انھیں عین مطابق شریعت ثابت کرنا قاضی القضاۃ صاحب کے وظائف میں داخل تھا۔ مثلاً اعلیٰ حضرت کو بدقسمتی سے عورتوں کی طرف کمال استغراق تھا اور ہر روز ان کے لئے لڑکیاں تلاش کی جاتی تھیں اور بیش قرار قیمت پر حاصل کی جاتی تھیں۔ چنانچہ ہمارے اعلیٰ حضرت کے حرم میں شاید نوسو اور ہزار کے درمیان عورتیں تھیں۔ اور بعض لڑکیاں افغانستان سے

بڑے بڑے خاندانوں کی چشم و چراغ تھیں یا نورستان کی تھیں اِن لڑکیوں کو سورتی کہا جاتا تھا۔ اور اعلیٰ حضرت انھیں بیویاں یا کنیزوں کے طور پر رکھتے تھے۔ میں نے قاضی القضاۃ صاحب سے اس لفظ کی وجہ تسمیہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ سورتی وہ کنیز ہے جسے اعلیٰ حضرت اپنی ذات کے لئے پسند فرمائیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ عورتیں کیونکر لونڈیاں کہلا سکتی ہیں۔ کہنے لگے کہ نورستان کو اعلیٰ حضرت کی فوجوں نے فتح کیا تھا۔ وہاں کی سب عورتیں لونڈیوں کے حکم میں آگئیں۔ اس لئے اعلیٰ حضرت نے حکم دیا کہ وہاں کی کوئی لڑکی شادی نہیں کر سکتی جب تک کہ اعلیٰ حضرت ان کے ولی کی حیثیت سے اجازت نکاح نہ دیں۔ چنانچہ ہر سال وہاں کی تمام لڑکیاں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔ اب جن پر اعلیٰ حضرت کی نگاہ انتخاب پڑ جاتی ہے وہ تو داخل حرم کر لی جاتی ہیں۔ اور باقی ماندہ کو واپس بھیج دیا جاتا ہے اور انھیں نکاح کی اجازت دی جاتی ہے۔ اب رہیں دوسری لڑکیاں تو ان کے ماں باپ ان لڑکیوں کو خود امیر صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اعلیٰ حضرت خوش ہو کر انھیں قبول فرماتے ہیں اور باپ کو انعام دیتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو شریعت اسلامیہ کی علانیہ توہین ہے کہنے لگے میاں امیر صاحب کے اعمال پر نکتہ چینی کرنا موت کو دعوت دینا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم بھی خاموش رہو ورنہ توپ پر اڑا دیئے جاؤ گے۔

یہ واقعہ میں نے مشتے "نمونہ از خروار" کے طور پر بیان کیا ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ اس حکومت میں شریعت اسلامیہ کی کیسی گت بنتی تھی اور یوں نام کو وہ عین مطابق شریعت اسلامیہ کہی جاتی تھی۔ قصہ مختصر افغانستان کی حکومت کا صحیح نقشہ لوئی چہار دہم کے الفاظ میں کھینچا جا سکتا تھا۔ اس سے جب فرانس کے وزیر اعظم نے کہا جہاں پناہ یہ حکم خلاف قانون ہے تو اس نے خفا ہو کر جواب دیا کہ "قانون تو میں ہوں" اسی طرح سے افغانستان میں حکومت اور قانون سب امیر صاحب کی ذات میں جمع تھے۔

ان کی زبان سے کسی حکم کا نکلنا قانون تھا۔ پھر شیخ سعدیؒ کی مثال ان پر بالکل صادق آتی تھی کہ :-

"گاہے بہ سلامے برنجندہ وگاہے بہ دشنامے انعام دہند"

اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ افغانستان میں بہ استثنائے چند ہر عہدہ دار اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اعلیٰ حضرت کی خوشنودئ مزاج کو زندگی کا مدعا بنائے۔ کوئی ذلیل ترین حرکت ایسی نہ تھی جو اعلیٰ حضرت کو خوش کرنے کے لئے، کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔

قصہ مختصر افغانستان میں کسی قانون و آئین کی حکومت نہ تھی نہ عمال حکومت کے اختیارات محدود و مقرر تھے کہ ان سے اپنے فرائض محولہ کے بارے میں سوال کیا جا سکے۔ نہ کوئی بجٹ تھا نہ سالانہ آمد و خرچ کا صحیح اندازہ۔ یوں کہنے کو تو قاضی القضاۃ، نائب قاضی القضاۃ، سپہ سالار اعظم، نائب سالار، گورنر، مستوفی الممالک یعنی وزیر خزانہ، خزانچی، کلرک سبھی عہدہ دار تھے اور ان کے مشاہرے بھی مقرر تھے لیکن ہر شخص اپنے اپنے حلقہ اقتدار میں صرف امیر صاحب سے خائف تھا۔ ورنہ موقع پاتا تو خود جو چاہے کر گزرتا تھا۔ نائب السلطنت صاحب اور معین السلطنت کے احکام چلتے تھے لیکن امیر صاحب کو ہر وقت ہر محکمہ میں مداخلت کا اختیار تھا۔ دو تین واقعات سے جو میرے سامنے ہوئے اس کی توضیح کرنا چاہتا ہوں۔ میرے گھر کے بالکل قریب مسجد علیا حضرت تھی۔ میں ہمیشہ اس میں فجر اور عشاء کی نماز پڑھنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن عصر کے وقت امیر صاحب کی سواری اس مسجد کے سامنے سے گزری۔ دیکھا تو وہ مسجد مقفل تھی۔ واضح رہے کہ تمام مساجد کے آٹھ سرکاری تنخواہ دار ملازم تھے اور ان کا فرض تھا کہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت کرائیں اور مسجد کی صفائی اور روشنی کا کماحقہ انتظام رکھیں۔ اعلیٰ حضرت نے پوچھا کہ اس مسجد کے پیش امام اور موذن کون ہیں میر محلہ کون ہیں اور محتسب کون ہے۔ محتسب ہمارے حبیبیہ کالج کا فارسی کا استاد بھی تھا۔ چاروں حاضر کئے گئے۔ اب

کیا تھا۔ ان کے آتے ہی اعلیٰ حضرت نے ان سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اپنے چوبداروں کو حکم دیا کہ انھیں دراز کردو۔ اب انھیں زمین پر لٹا دیا گیا اور کپڑے اتار کر زدو کوب شروع کردی۔ اور اس بری طرح سے پیٹا کہ میرا دل بھر آیا۔ میرے لئے یہ پہلا موقعہ تھا جو اس طرح انسانوں کو پٹتے دیکھا۔ جب وہ خوب پٹ چکے تو اعلیٰ حضرت نے حکم دیا کہ ان سب کو ملازمتوں سے برطرف کیا جاتا ہے اور جتنی تنخواہ یہ اب تک لے چکے ہیں وہ سب کی سب ان سے واپس لی جائے اگر یہ نہ دے سکیں تو ان کے گھر ضبط کرلئے جائیں۔ دوسرے دن ہمارے نام مدرسہ میں حکم آیا کہ محتسب کو مدرسہ کی ملازمت سے موقوف کیا جاتا ہے اور اس کی تمام تنخواہ بحق سرکار ضبط کی جاتی ہے۔ میں اس حکم کو پڑھ کر کانپ اٹھا۔ مگر صبر و شکر کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب وہ محتسب صاحب تیسرے دن خوش خوش تشریف لائے۔ اور بڑے فخر سے مجھے معین السلطنت کا پروانہ دکھلایا کہ اعلیٰ حضرت نے اُسے نہ صرف معاف کردیا بلکہ ایک خلعت سے بھی نوازا ہے۔ وہ فی الفور ملازمت پر بحال کر دیئے گئے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ رمضان المبارک میں ہوا۔ ایک دن دیگچہ پزانی ہورہی تھی۔ اور اعلیٰ حضرت خود بھی کھانا پکانے میں مشغول تھے۔ کہ اتنے میں مستوفی الممالک حاضر ہوئے۔ وہ ایک معمر اور متین شخص معلوم ہوتے تھے۔ اس وقت اعلیٰ حضرت کا مزاج حاضر نہ تھا۔ ان سے ایک سوال پوچھا۔ انھوں نے جواب تو دیا مگر اعلیٰ حضرت اس پر بگڑ گئے فوراً حکم دیا کہ اسے دربار سے نکال دو۔ فوراً چوبدار اس غریب پر پل پڑے اور اسے نہایت ذلت سے زدوکوب کرکے دربار سے باہر لے گئے۔ دوسرے دن جب اعلیٰ حضرت کا مزاج حاضر تھا تو حکم دیا کہ مستوفی الممالک کو بلاؤ وہ پھر حاضر ہوئے فوراً انھیں خلعت اور انعام سے سرفراز فرمایا اور کہا کہ ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ وہ شخص اس قدر مسرور ہوا کہ گویا اسے کوئی بہت بڑی دولت

مل گئی ہے اور پہلے دن کی ذلّت ورسوائی کا خیال تک نہ تھا۔

یہ تذلیل اور زدوکوب ایسی عام بات تھی کہ افغانستان کا کوئی عہدہ دار اس میں عار محسوس نہ کرتا تھا بلکہ ہر شخص فخریہ اس کا ذکر کرتا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ اعلیٰ حضرت نے مجھے زدوکوب تو کی مگر اس کے بعد انعام سے بھی نوازا۔ ان باتوں سے عمال میں خودداری کے کامل فقدان کے علاوہ عجب طرح کی خود غرضی اور بے اصول زندگی پرورش پاتی تھی اور ملک وملّت کی بہی خواہی یا فرض شناسی کا کسی کو خیال تک نہ آتا تھا۔ معدودے چند مستثنیات کے علاوہ کوئی شخص بھی ایسی پست ذہنیت سے بالاتر نہ تھا۔ اس کا جو اثر حکومت کے نظم ونسق پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ رشوت ستانی کی انتہائی گرم بازاری تھی اور سوائے چند حکام بالا کے سب اس میں دلیر اور جری تھے۔ میں نے اتنی شدید بددیانتی کسی ملک میں نہیں دیکھی۔ غالباً اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ: ع

عسس بہ خانہ وشاہ درحرم سرا خفت است

کسی شخص کو اپنے کام کی باضابطہ دیکھ بھال اور محاسبے کا اندیشہ نہ تھا۔ دوسرے ہر شخص ظاہری شان وشوکت کا اسیر تھا۔ آپ معمولی سے معمولی کلرک کے گھر بھی چلے جائیں تو اس کے ہاں نہایت پُر تکلّف قالین کے فرش، مخمل کے گدیلے، اطلس کے تکیے، اور ریشم کے پردے دیکھیں گے۔ نوکر چاکروں کے علاوہ دو ایک کنیزیں بھی صاحبِ خانہ کے لئے موجود ہوتی تھیں۔ یہ دیکھ کر خیال پیدا ہوتا تھا کہ شاید اس کی تنخواہ ہزار بارہ سو روپے ہوگی۔ لیکن کسی کلرک کی تنخواہ اُس زمانہ میں انگریزی سو روپے سے زیادہ نہ تھی۔ اور سو روپیہ بھی پرانے صدر منشیوں اور دفتر کے منتظم کو ملتے تھے۔ غرض یہ سب شاہ خرچیاں "بالائی آمد" کی بدولت تھیں۔ افغانستان میں رشوت ستانی کا یہ حال تھا کہ آپ کوئی کام بغیر رشوت کے کرا ہی نہ سکتے تھے۔ تنخواہ شمار میں نہ تھی۔ ہر ملازمت

ہیں پہلے یہ سوچا جاتا تھا کہ رشوت کمانے کے لئے کتنے مواقع ہیں۔ جب صورت حال ایسی ہو تو حکومت کیا خاک ہوگی۔ افغانستان میں فی الحقیقت اِس وقت کوئی منظم حکومت نہ تھی۔ دو دو۔ تین تین سال کے بقایا چلے آرہے تھے۔ بہت سے افسروں کو مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اور ان کی گذر لوٹ کھسوٹ پر تھی۔ بدامنی کا یہ حال تھا کہ لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کا کوئی ذمّہ دار نہ تھا۔ چوریوں کی بہت کثرت تھی۔ اور جرائم کی بھرمار کسی معاملہ کا اعلیٰ حضرت تک پہنچنا محال نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اور اگر کوئی معاملہ امیر صاحب تک پہنچ جاتا تھا تو پھر یا تو اس کا فیصلہ اسی وقت ہو جاتا تھا یا پھر ایسا ملتوی ہوتا کہ اس کی پیشی کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ کیونکہ اعلیٰ حضرت کو کسی بھولے ہوئے واقعہ کی یاد دلانا سوتے فتنہ کو بیدار کرنا تھا۔ اور اگر ان کا مزاج برہم ہوا تو یاد دلانے والے کی فوری مرمت ہو جاتی تھی۔

مجھے جب یہ حکم ملا کہ نصابِ تعلیم تیار کر کے حضور میں پیش کیا جائے تو میں نے نہایت محنت سے نصابِ تعلیم مرتب کیا اس میں کابل میں ایک اوّل درجہ کی یونیورسٹی کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ اس کی تین نقلیں کروائی گئیں۔ ہر ایک شاید (۸۰) (۹۰) فلسکیپ کاغذوں پر تھی۔ وہ پہلے معین السلطنت صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی۔ انھوں نے اُسے بہت پسند کیا اور اعلیٰ حضرت کے حضور میں خود لے جا کر پیش کیا اعلیٰ حضرت نے نوازشِ خسروانہ سے مجھے شرف باریابی بخشا۔ اور کھانے پر مدعو فرمایا۔ کھانے پر تمام شہزادگان مصاحبانِ خاص۔ اور نادر شاہ مرحوم اور ان کے تمام بھائی مدعو تھے۔ کھانے سے پہلے میں نے باقاعدہ سکیم کی ایک نقل حضور میں پیش کی۔ شاہی خوش نویس وہیں کھڑا تھا۔ امیر صاحب نے اس کو حکم دیا کہ اس پر علم لکھ دو کہ قاضی القضاۃ صاحب مذہبی نقطۂ نظر سے معاینہ کر کے اسے ہمارے حضور میں پیش کریں کھانے بعد ہم سب رخصت ہو گئے لیکن اس کے بعد میں قریباً آٹھ مہینے کابل میں رہا۔ اس عرصے میں تو اس

تجویز کو دوبارہ اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش ہونے کا موقع ملا نہ تھا۔ گو میرے آنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ امیر امان اللہ خاں نے اس کو نکلوا کر بہت کچھ اسی کے مطابق افغان کا نظامِ تعلیم استوار کیا۔

اس تجویز کے متعلق ایک دلچسپ واقع لکھتا ہوں۔ ڈنر کے دوسرے دن۔ قاضی القضات صاحب نے مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ مولوی صاحب یہ آپ نے کیا ستم ڈھایا ہے۔ کہ نصاب تعلیم میں قرآن شریف کا ترجمہ رکھ دیا ہے۔ بچے قرآن شریف جیسی پُر حکمت کتاب کو نہیں سمجھ سکتے اس لئے وہ وہابی ہو جائیں گے۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ جناب قاضی صاحب اللہ تعالیٰ نے ہم پر فرض کیا ہے کہ ہم قرآن شریف خود پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں۔ لیکن آپ لوگ اس پر تالے لگاتے ہیں۔ اس پر قاضی صاحب سے بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ جب وہ بالکل لاجواب ہو گئے تو انہوں نے کہا کہ مولوی صاحب میرا یہ فیصلہ ہے کہ جب تک آپ اِس نصاب میں سے قرآن شریف کے ترجمہ کو نہ نکالیں گے۔ میں اِس کے اجرا کی اجازت نہیں دونگا۔ میں نے کہا کہ قاضی صاحب میرا بھی فیصلہ ہے کہ قرآن شریف اس نصاب میں رہے گا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ پیشتر اس کے کہ میں اپنے قلم سے کاٹوں خدا کرے کہ میرے دونوں ہاتھ شل ہو جائیں اور اگر آپ اسے خارج کرینگے تو میں یقیناً ایک لمحے کے لئے بھی افغانستان کی نوکری نہیں کروں گا" انھوں نے کہا کہ میں قاضی القضات ہوں اور میرے ایک فتوے سے تم کل ہی توپ سے اُڑا دیئے جاؤگے۔ میں نے کہا کہ اچھی بات ہے جو کچھ آپ کے اختیار میں ہے آپ کر لیجئے۔ کیونکہ میرا ایمان ہے کہ مومن پر موت دو دفعہ طاری نہیں ہوتی اور میں اُٹھ کر چلا آیا۔

دوسرے دن علی الصبح میں نے معین السلطنت صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام معاملہ عرض کر دیا۔ انھیں میری صحت رائے کا اطمینان ہو گیا تو نظارۃ المعارف کا جلسہ طلب کیا۔ اس میں سپہ سالار صاحب یعنی غازی نادر خاں مرحوم اور قاضی القضات صاحب دونوں موجود تھے۔ معین السلطنت صاحب نے فرمایا کہ آج ہم صرف مولوی محمد علی کے

مجوزہ نصاب تعلیم پر بحث کریں گے۔ چنانچہ قاضی صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں اس نصاب تعلیم کے مخالف ہوں۔ اور جب تک قرآن شریف کے ترجمہ کو اس میں سے نہ نکال دیا جائے میں اسے جاری کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا کیونکہ قرآن شریف کا ترجمہ پڑھانے سے بچے بدعقیدہ ہو جائیں گے۔ اب صاحب صدر نے مجھے حکم دیا کہ ان کے اعتراض کا جواب دوں میں نے اس کے جواب میں کوئی آدھ گھنٹہ تک تقریر کی۔ جب میری تقریر ختم ہوئی تو صاحب صدر اور سپہ سالار صاحب نے بہ یک وقت فرمایا۔ مولوی صاحب آپ نے تو کمال کر دیا۔ ایسی مدلل اور پُر مغز تقریر ہم نے نہیں سُنی اور ہمارے خیال میں اب قاضی صاحب کو آپ کے مجوزہ نصاب تعلیم کی مخالفت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ صاحب صدر کے الفاظ نے جادو کا کام کیا اور قاضی صاحب فوراً کھڑے ہوئے اور کہا۔ کہ اگر حضرت عالی کی مرضی مبارک یہی ہے کہ یہ نصاب تعلیم اسی طرح سے منظور کر لیا جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ صاحب صدر نے فرمایا کہ ہاں میں چاہتا ہوں کہ یہ جلد از جلد نافذ ہو۔ چنانچہ قاضی القضاۃ صاحب نے حامی بھری کہ میں اس کی تائید کر کے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ مگر اس کا جو حشر ہوا وہ اوپر لکھ چکا ہوں۔

افغانستان جس کے متعلق میں اس قدر امیدیں لیکر گیا تھا سیاسی طور پر بالکل مُردہ تھا۔ امیر حبیب اللہ مرحوم جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں نہایت سخت مستبد اور مطلق العنان بادشاہ تھے، اس لئے وہ ہر سیاسی سرگرمی کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور اس لئے افغانستان میں کسی سیاسی تحریک میں منسلک ہونا موت کو دعوت دینا تھا۔ اس پر ستم یہ تھا کہ امیر صاحب کا سارا بجٹ انگریزوں کے روپے کا مرہونِ احسان تھا۔ ان کا تمام ذاتی خرچ ہندوستان کے امدادی روپے سے چلتا تھا۔ پھر مختلف بیش قیمت تحائف بھی سرکار انگریزی سے اعلیٰ حضرت کی خدمت

میں پہنچتے رہتے تھے ۔ بڑے بڑے افغان افسر تقریباً تمام انگریزوں کے تنخواہ دار تھے ۔ مجھے وہاں پہنچکر اپنی بے بسی کا احساس ہوا اور تمام دوستوں نے بھی تاکید کی کہ یہ بڑی خار دار وادی ہے اِس لئے بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے ۔ انگریزی سازشوں کے جال نے افغان حکومت کو عضو معطل بنا رکھا تھا۔ کسی شخص پر اعتماد کرنا بڑی بے وقوفی تھی ۔

میں اس عرصہ میں افغانستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتا رہا اور مختلف اشخاص کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا، تاکہ کسی نہ کسی طرح اپنے اصلی مشن کو سرانجام دوں ۔ مجھے معلوم ہوا کہ نائب السلطنت سردار نصراللہ خاں مرحوم اور ان کی پارٹی سخت انگریز دشمن ہے ۔ لیکن وہ بھی اپنے بڑے بھائی کے خوف سے علانیہ ایسے لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتے جو انگریزوں کے مخالف ہوں ۔ مشکل یہ تھی کہ میں معین السلطنت صاحب یعنی سردار عنایت اللہ خاں ۔ ولیعہد حکومت کا ماتحت بنا دیا گیا تھا اور معین السلطنت کے ہر ماتحت کو نائب السلطنت صاحب نہایت مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے ۔ اِس لئے میرے لئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ میں علانیہ نائب السلطنت صاحب سے جاکر ملوں اور سیاسی امور پر گفتگو کروں ۔ معین السلطنت صاحب گو نہایت ہوشمند نوجوان تھے لیکن اپنے باپ کے خوف سے سیاسی تحریکوں سے بہت دور بھاگتے تھے ۔ مجھے اُنھوں نے اجازت دی کہ بے شک تم نائب السلطنت کی خدمت میں جایا کرو مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ وہ تمہارا اعتبار نہیں کریں گے اس لئے تم کوئی ایسا واسطہ ڈھونڈو جو ان کی بدظنی کو دور کرے ۔

مولوی عبدالرحیم مرحوم جن کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں ۔ جب باغستان پہنچے تو اُنھوں نے جاتے ہی جماعت مجاہدین میں کافی رسوخ حاصل کر لیا اور

امیر المجاہدین کے وکیل بن کر کابل آئے اور نائب السلطنت پھر خود امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کی۔ اس وقت چونکہ جنگ زوروں پر تھی اور انگریزوں کو قدم قدم پر شکست ہو رہی تھی اس لئے اعلیٰ حضرت بھی یہ چاہتے تھے کہ وہ کچھ نام پیدا کر لیں۔

کبھی غلوبت زیسا کے رام کرنے میں

کبھی یہ شوق کہ کچھ کام ہو خدا کے لئے

مولوی عبدالرحیم نے اپنی شخصیت کو انگریزوں سے چھپانے کے لئے اپنا نام بدل لیا تھا اور سفارتی کاغذات میں مولوی محمد بشیر کے نام سے متعارف تھے۔ وہ حیرت انگیز انسان تھے۔ ان کی انتظامی قابلیت اور سیاسی سوجھ بوجھ بے مثال تھی انھوں نے کابل پہنچتے ہی امیر صاحب کے مزاج میں اتنا عمل دخل پیدا کر لیا کہ امیر صاحب نے ان کو یاغستان کی تنظیم کے لئے مامور فرمایا اور بارہ ہزار روپیہ سالانہ تنظیمی اخراجات کے لئے ان کے حوالے کیا۔ مولوی محمد بشیر کو کابل میں میری جستجو ہوئی آخر ایک دن رات کے دس بجے وہ میرے گھر آ پہنچے، میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے اس وقت کس قدر خوشی ہوئی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں بفضلہ اپنے مشن میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مگر اس وقت یہ طے پایا کہ میں ابھی کچھ دن اور خاموش رہوں۔

ایک مہینے کے بعد مولوی محمد بشیر صاحب واپس لوٹے اور بہت کامیاب لوٹے، انھوں نے یاغستان کے اکثر ملاؤں سے امیر صاحب کے نام بیعت کے خطوط حاصل کر لئے۔ واضح رہے کہ یاغستان اس علاقے کو کہتے ہیں جو تقسیم سے قبل سرکار انگریزی کی سرحد اور افغانستان کی سرحد کے مابین واقع تھا۔ افغان سرحد کا تعین ڈیورنڈ کمیشن (Durand Commission) نے کیا تھا اور اس وقت یہ تمام علاقہ انگریزی حلقہ اثر کہلاتا تھا۔ لیکن درحقیقت وہاں کوئی حکومت نہ تھی اسی لئے اس کو یاغستان کہتے تھے جس کے لفظی معنی ہیں "باغیوں کا ملک" وہاں صرف ملاؤں کی حکومت تھی۔

مختلف علاقے، مختلف قبائل کے قبضے میں تھے اور ہر قبیلے میں ایک ملّا ہوتا تھا وہ ملّا نہ صرف ان لوگوں کا مذہبی پیشوا ہوتا تھا بلکہ تمام معاملات میں اُن کا حکم ناطق تھا۔ قبائلی زندگی حیرت انگریز طریقے پر پرانی تھی اور ان لوگوں کا اخلاقی معیار نہایت ہی بلند تھا۔ ہر قبیلے کی ایک پنچایت ہوتی تھی، وہ پنچایت ملا صاحب کی سرکردگی میں اپنے اپنے حلقے میں پورا اقتدار رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ کسی شخص کو قبیلہ بدر کر دینا، اس کا گھر بار جلا دینا، یہ سب کچھ پنچایت کے اختیار میں تھا اور کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ پنچایت کے فیصلے کے خلاف جبکہ اس کو ملّا صاحب کی منظوری حاصل ہو جائے لب تک ہلا سکے۔ قصّہ مختصر کسی ملّا کا امیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لینا اس امر کا مترادف تھا کہ اس کا قبیلہ انگریزوں کے بجائے امیر صاحب کے تابع ہے۔ بلکہ انگریزوں کا سخت مخالف و معاند۔

چنانچہ جب مولوی محمد بشیر صاحب یہ خطوط لیکر آئے تو پہلے نائب السلطنت صاحب نے خود ان کو لے جا کر اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ اعلیٰ حضرت اِن خطوط کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور مولوی بشیر صاحب کو ملّا بشیر کا خطاب مرحمت فرمایا اور تمام یاغستان کے لئے ان کو وکیل مختار مقرر کیا اور ایک فرمان اسی مضمون کا مرحمت فرمایا کہ ملّا بشیر امیر صاحب کی طرف سے بیعت اطاعت لینے کے مجاز ہیں۔ افغانستان میں سیاست شجر ممنوعہ کا حکم رکھتی ہے۔ کسی ملازم سرکار کی مجال نہ تھی کہ وہ کسی سیاسی کام میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شرکت کرے۔ خود اعلیٰ حضرت پر انگریزی حکومت کا اس قدر خوف طاری تھا کہ وہ علانیہ انگریز کے خلاف کسی سازش میں شرکت کرنے سے ڈرتے تھے۔ ملّا بشیر کا یہ کمال تھا کہ وہ اعلیٰ حضرت کو خوف وہراس کے اِس گنبد سے نکال لائے۔

نائب السلطنت صاحب پہلے ہی ہر ایسی تحریک میں جو انگریزوں کے خلاف

ہوتی نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے تھے، اس لئے ملا بشیر نے صحیح معنیٰ میں ان سے میرا تعارف کرایا اور میرے منصوبے کے متعلق ان سے ذکر کیا اور آخر یہ قرار پایا کہ محمد علی اپنی تحریر حاجی عبدالرزاق صاحب۔ نائب قاضی القضاۃ صاحب کو دے دیں، وہ اس کو نائب السلطنت صاحب تک پہنچا دیں۔ یہ حاجی عبدالرزاق صاحب بھی عجیب آدمی تھے نہایت فہیم دوراندیش اور مردم شناس تھے۔ انگریزی دشمنی ان کے رگ و ریشے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ افغانستان کے عہدہ دار بہت کم قابلِ اعتماد تھے، بلکہ زیادہ غدار اور انگریزی ایجنٹ تھے۔ لیکن حاجی صاحب ان نادر ہستیوں میں سے تھے جو سرتا پا خلوص اور اسلام کے سچے محب تھے۔ ان کی سیاسیات حاضرہ سے واقفیت غیر معمولی تھی۔ ملا بشیر نے ان سے جب میرا ذکر کیا تو وہ خود میرے گھر تشریف لائے۔ اور میں نے اپنی تجویز ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ جس کا مفاد یہ تھا کہ ہندوستان اسلحہ اور فوج سے تقریباً خالی ہو چکا ہے۔ صرف گیارہ ہزار فوج اور ایک توپ خانہ ہندوستان میں ہے۔ اس لئے اعلیٰ حضرت کے لئے اس سے بہتر موقعہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا نہیں ہو سکتا۔ حاجی صاحب سُن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ تم اس کو قلمبند کر دو میں اعلیٰ حضرت کو ضرور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کر لوں گا۔ میں نے تجویز قلمبند کر کے حاجی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس میں یہ بھی صراحت کر دی تھی کہ تاریخ اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ انگریزی سیاست اور انگریزی اقتدار اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اس برطانوی قیصریت کی موت تمام اسلامی ممالک کی آزادی کا پیغام لائے گی۔ برطانوی ملوکیت پر کاری ضرب لگانے کا اس سے بہتر موقع پیدا نہیں ہو سکے گا۔ ہندوستان پر حملہ کرنے سے پہلے اعلیٰ حضرت کو انگریزوں سے سمجھوتہ کر لینا چاہیئے، پھر ہندوستان افغانستان کی اعانت کے لئے اُٹھ کھڑا ہو گا اور انگریزی حکومت کا بہت آسانی سے خاتمہ ہو سکے گا۔ حاجی صاحب نے یہ تحریر

نائب السلطنت صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ انھوں نے پہلی دفعہ مجھ کو تخلیہ میں طلب کیا۔ میرے منصوبے پر خوب بحث کی۔ اس کے بعد وہ اس کو اعلیٰ حضرت کی خدمت میں لے گئے۔ اس کے چند روز بعد حاجی عبدالرزاق صاحب نے مجھ کو بلایا اور فرمایا کہ کہ اعلیٰ حضرت ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور اس غرض کے لئے کانگریس سے معاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کام کے لئے مولانا محمد علی یا حکیم اجمل خاں صاحب یا پنڈت موتی لال نہرو یا کوئی اور اس پائے کے ہندوستانی لیڈر کو کابل آنا چاہیئے۔

اِس عرصہ میں برٹش گورنمنٹ بھی غافل نہ تھی اور افغانستان کی رتی رتی بھر کی خبریں انگریزی حکومت کو مل رہی تھیں چنانچہ انھوں نے ایک طرف تو ۱۹۱۶ء میں کانگریس مسلم لیگ کا معاہدہ لکھنؤ کرایا۔ اور دوسری طرف مسلمان لیڈروں کی گرفتاری یا نظربندی کے احکام جاری کئے۔ حکیم صاحب مرحوم کو جب کابل کی دعوت پہنچی تو انھوں نے مولانا عبیداللہ سندھی کو جن کی گرفتاری کی افواہیں گرم تھیں۔ ملّا بشیر کے پاس بھیجدیا۔ اور وہ آزاد علاقے سے کابل پہنچ گئے۔ مجھے اس کی پہلے سے اطلاع ہو چکی تھی اس لئے میں نے مولانا کے لئے زمین ہموار کر دی تھی۔ مولانا میرے ہاں آکر ٹھیرے۔ اور اب میرا گھر کابل میں سیاسی گفتگو کا مرکز بن گیا۔ لاہور کے چند طلبا جو ہجرت کرکے گئے انگریزوں کے اشارے سے کابل میں گرفتار کر لئے گئے تھے، مولانا سندھی کے کابل آنے پر امیر صاحب نے ان لڑکوں کو بھی رہا فرمادیا۔

یہی زمانہ تھا جب کہ جرمنی سے طہران کے راستے ایک مشن آپہنچا۔ اس مشن کے رئیس راجہ مہندر پرتاب تھے اور Von Henting فون ہنٹنگ قیصر ولیم کے وکیل مختار۔ ناظم بے سلطان روم کے وکیل مختار اور مولانا برکت اللہ غدر پارٹی کے نمائندے اور دوسرے اراکین تھے۔ اس مشن کے آتے ہی کابل میں بل چل مچ گئی۔ کیونکہ ان کی آمد ایسی نہ تھی کہ خفیہ رکھی جا سکتی۔ امیر صاحب کو اپنے ملازمین میں

سے کوئی ایسا معتمد علیہ نہ ملا۔ جو انگریزی۔ فرانسیسی۔ اور فارسی پر عبور رکھتا ہو۔ اس لئے جرمن مشن کے مراسلات وغیرہ کا فارسی میں ترجمہ کرنا اور ان کو نائب السلطنت صاحب کی وساطت سے اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کرنا مجھے تفویض ہوا مشن نے اس بات پر زور دیا کہ افغانستان فوراً انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ ہندوستان کی ایک عارضی حکومت افغانستان میں قائم کی جائے جو افغانستان کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کرے اور اُسے ہندوستان پر حملے کی دعوت دے۔

ہندوستان کی یہ Provisional عارضی حکومت بنائی گئی۔ اس کے صدر راجہ مہندر پرتاب۔ نائب صدر مولانا عبیداللہ سندھی۔ وزیر اعظم مولانا برکت اللہ۔ اور وزیر خارجہ راقم الحروف بنائے گئے۔ ملا بشیر کو وزیر دفاع اور یاغستان کی لشکرکشی کا ذمہ دار بنایا گیا۔ ایک پوری اسکیم حملے کی تیار کی گئی۔

ہندوستان پر حملے کے لئے ضروری تھا کہ امیر صاحب کے اسلحہ خانے کا جائزہ لیا جائے۔ اور فوجی تیاری شروع کر دی جائے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت نے کمال جرأت سے کام لیتے ہوئے تمام انگریز ملازموں کو برطرف کر دیا۔ اور کیپٹن نیڈرماسٹر کو تمام کام تفویض کر دیا جو بہت ہوشیار اور اپنے فن کا ماہر تھا۔ اس نے جب توپ خانہ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ انگریز ملازمین نے تمام توپوں کو بیکار کر دیا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ان کی درستی کا کام شروع ہوا۔

انگریزوں کے اخراج نے امیر صاحب کے تمام عزائم کو بے نقاب کر دیا۔ اور انگریزی حکومت کو اس وقت یقین ہو گیا کہ امیر صاحب اب ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں

انگریزی قوم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر مشکل سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈھ نکالتی ہے۔ جس قدر زیادہ پرخطر موقعہ ہو اسی قدر ان کی سیاست زبردست

ہوتی ہے۔ مجھے وزیر اعظم مسٹر ایس کوئتھ کا مقولہ رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریزی قوم کی تاریخ پڑھو تو تم کو یہ معلوم ہوگا کہ "ہم نے کوئی لڑائی نہیں جیتی۔ مگر کوئی جنگ نہیں ہاری" انگریز یہ سمجھ چکے تھے۔ کہ افغانستان کا حملہ ان کی موت کا پیغام ہے۔ اس لئے انھوں نے چالبازی سے وہ کام نکالا۔ جو وہ ہتھیار سے نہ نکال سکتے تھے

کابل کے سب سے بڑے پیر جن کا نام میں ارادۃً چھوڑتا ہوں۔ افغانستان میں بہت بڑے روحانی پیشوا مانے جاتے تھے۔ اور خود اعلیٰ حضرت بھی ان سے بیعت تھے۔ اب ان کو انگریزوں نے بلایا اور بہت بڑا لالچ دے کر ان کو اس بات پر آمادہ کیا اور کابل جاکر امیر صاحب کو جنگ کے ارادے سے باز رکھیں۔ پیر صاحب کابل پہنچے اعلیٰ حضرت ان کی قدمبوسی کے لئے ان کی فرودگاہ پر تشریف لے گئے۔ اور ان سے تمام منصوبے کا ذکر کرکے دعا کے طالب ہوئے۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ میں تین دن تک استخارہ کروں گا اور پھر چوتھے روز تم کو اس کا جواب دوں گا۔ ہمارا ماتھا فوراً ٹھنکا۔ جلدی سے ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی گئی اور یہ فیصلہ ہوا کہ اگر اعلیٰ حضرت اس تجویز کو بدل بھی دیں تو بھی اپنے ارادے سے باز نہیں آئیں گے۔ بلکہ کمیشن کے تمام ممبر یاغستان پہنچکر لوگوں کو منظم کرکے ہندوستان پر حملہ کردیں گے۔

اس عرصے میں مولانا سندھی بھی معمولی اختلافات کی بنا پر ہم لوگوں سے ناراض ہوگئے تھے۔ انہوں نے محمود طرزی سے راہ و رسم نکالی تھی۔ وہ امیر حبیب اللہ خاں کے معتوب اور اپنے تفرنج کی وجہ سے بدنام تھے۔ ان کی بڑی بیٹی عنایت خاں کی اور منجھلی بیٹی۔ امان اللہ خاں کی بیوی تھیں جو بعد میں ملکہ ثریا بنیں۔ لیکن طرزی نے غالباً مولانا سندھی مرحوم کی تحریک سے اپنے بڑے داماد (یعنی ولیعہد صاحب کو ہم سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر خدا کی شان ان کی ہر کوشش کا نتیجہ الٹا نکلا۔ یہاں تک کہ پیر صاحب منصۂ شہود پر تشریف لائے۔ پیر صاحب نے استخارہ کے بعد امیر صاحب کو

یہ بتلایا کہ ہندوستان پر حملہ کرنا افغانستان کی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ محمد علی جینی راقم الحروف افغانستان کا دشمن ہے۔ اس کو افغانستان سے فوراً نکال دینا چاہیئے۔ کہا جاتا ہے کہ امیر صاحب کو آٹھ کروڑ روپے کا لالچ دیا گیا اور پچاس لاکھ روپیہ پیر صاحب کو اس کارکردگی کے صلے میں ملا۔ پیر صاحب کے اس فیصلے کا اثر نائب السلطنت صاحب اور سپہ سالار نادر شاہ مرحوم پر بہت ہوا۔ اور ان دونوں صاحبوں نے علانیہ اعلیٰ حضرت سے کہا کہ اگر آپ نے جرمن وفد کو انگریزوں کے حوالے کیا یا مولوی محمد علی کو کسی قسم کی سزا دی تو ہم سب مخالفت کریں گے اور ملک میں ہنگامہ ہو جائیگا۔ شاید اسی لئے امیر صاحب روپیہ لینے کے باوجود اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا نہ سکے۔

ادھر ہم نے یہ تجویز کی کہ میں افغانستان سے غائب ہو جاؤں تاکہ انگریزوں کو امیر صاحب کے خلاف اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ مجھے افغانستان کا وکیل مختار بنا کر جرمنی بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ میں نے ملازمت سے استعفٰی دے دیا۔ اور جرمنی جانے کی تیاری شروع کی۔

اس عرصہ میں کابل کے بعض ارباب اقتدار کے اشارہ سے میرے گھر پر مسلح ڈاکہ پڑا۔ جس میں انھوں نے مجھے قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے میں خود بچ گیا۔ البتہ سامان بمع تمام کاغذات کے چوری ہو گیا۔ نائب السلطنت صاحب اور سپہ سالار نادر شاہ کا خیال تھا کہ یہ ڈاکہ انگریزوں کے ایما سے پڑا۔ اور اس کی تہ میں معین السلطنت صاحب کے سکرٹیری تھے جو محمود بیگ طرزی کے خاص الخاص آدمی تھے۔ واللہ اعلم۔ پھر چند روز کے بعد خود اعلیٰ حضرت کے فرمان سے سو آدمیوں نے میرے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اور اعلیٰ حضرت کا حکم لا کر دیا کہ مجھے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر ساتھ ہی کپتان یونس نے نہایت مؤدبانہ لہجہ میں مجھ کو تنہائی میں لیجا کر کہا کہ سپہ سالار نادر خاں نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف

نہ دی جائے، بلکہ ہر ممکن سہولت مہیا کی جائے۔آپ بے شک ہفتہ عشرہ تک یہاں ٹھیریں۔اور سپہ سالار صاحب سے مل کر تمام پروگرام طے کریں۔پھر اس نے مجھ سے فرمان پر باقاعدہ دستخط لئے، کہ میں اپنے تئیں حوالے کرتا ہوں۔اور اپنے تمام سپاہیوں کو رخصت کر دیا۔میں اُٹھا اور سیدھا سپہ سالار صاحب کے درِ دولت پر پہنچا وہاں مجھے تمام سازش کا علم ہوا۔سپہ سالار صاحب اور ان کے والد ماجد چشم پُرآب تھے۔اور فرمانے لگے کہ مولوی صاحب یہ اسلام اور افغانستان کی بدقسمتی ہے کہ آپ کو اس طرح سے نکالا جا رہا ہے۔لیکن ہم آپ کو انگریزوں کے ہاتھ میں نہیں پڑنے دیں گے۔اِس کے بعد میں سپہ سالار صاحب کے ہمراہ نائب السلطنت صاحب کے دولت خانے پر پہنچا۔نائب السلطنت صاحب نے فرمایا کہ میں نے تمہارے باغستان جانے کا انتظام کر دیا ہے۔پھر فون ھنٹنگ۔راجہ مہندر پرتاب۔ اور مولانا برکت اللہ سے طویل مشورت کے بعد یہ طے پایا، کہ میں ملا بشیر کی معیت میں یاغستان چلا جاؤں۔اور قبائل کو منظم کر کے انگریزوں پر دھاوا بولوں۔نائب السلطنت صاحب نے وعدہ فرمایا کہ وہ جرمن مشن کے بعض ارکان کو وہاں بھیجیں گے تاکہ قبائل کی تنظیم کا کام پورا اور مکمل کیا جاسکے۔خود انہوں نے اسلحہ اور سامان مہیا کرنے کا وعدہ فرمایا۔بعض وجوہات کی بنا پر جن کا ذکر آگے آئے گا۔جرمن وفد کے ارکان اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔میرے لئے یہ سخت امتحان کا وقت تھا۔کیونکہ اس انقلابی تحریک میں کود کر پھر واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔

مولانا سندھی کو میری روانگی کا علم ہوتے ہی اپنے کئے پر پشیمانی ہوئی۔اور وہ بہت روئے۔اور نہایت فراخ دلی سے مجھے گلے لگا کر آئندہ تعاون کا یقین دلایا۔اس لئے میں نے نصف اثاثہ آئندہ انقلابی پروگرام میں خرچ کرنے کے لئے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔اور خود صرف تین پونڈ لے کر اپنا تمام سامان کابل ہی

چھوڑ کر ملا بشیر کی معیت میں جون ۱۹۱۶ء میں کابل سے خفیہ نکلا۔ اور ایک ہفتہ کی نہایت دشوار گزار مسافت طے کر کے یاغستان میں ملا بشیر صاحب کے مستقر پر پہنچ گیا۔

درین دریائے بے پایاں۔ دریں طوفان موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجرہا و مرسا ہا

کابل کے بعد

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

کابل سے نکلے ہوئے مجھے کچھ اوپر پینتیس (۳۵) سال گزر چکے ہیں۔ اس لئے اس وقت جو جذبات میرے سینے میں موجزن تھے، ان کا صحیح نقشہ کھینچنا نہ صرف مشکل بلکہ قریباً محال ہے۔ لیکن بعد کی ناکامیوں اور تلخ تجربوں نے ان جذبات کے بعض نقوش کو بہت پختہ کر دیا ہے۔ اور میں اب تک بعض ناکامیوں کی تلخی محسوس کرتا ہوں جس کی وجہ سے وہ نقوشِ زخم تازہ کی مانند ہر وقت ہرے رہتے ہیں لیکن اس قدر میں ضرور رکھوں گا کہ کابل جاتے وقت اور کابل سے نکلتے وقت دو جذبات نہایت شدت سے میرے سینے میں موجزن تھے اور بعد کے تجربوں نے انھیں اور پختہ کر دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ مسلمان اقوام کے لئے ایک ہی راہِ نجات ہے اور وہ یہ کہ مغربی استعمار سے مکمل آزادی حاصل کرنے کے ساتھ خود اپنے قومی اور ملکی جابر حاکموں کے پنجۂ استبداد سے بھی آزاد ہوں۔ بعد کے تلخ تجربات نے اس یقین کو اور

بخشنہ کر دیا ہے کہ عام انگریزی خواں طبقہ کا خیال کہ مغربی طاقتوں کی غلامی سے نجات ہی مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کی کلید ہے بالکل بے اصل ہے جب تک مسلمان اپنی اندرونی اصلاح کر کے ایک صحیح اسلامی جمہوری سلطنت قایم کر کے مسلمان جبابرہ کے دستِ تظلم سے نجات حاصل نہ کرلیں۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جس نے ہماری تمام ملت کی زندگی کو مسموم کر دیا ہے اور ہم حقیقی ترقی کی بجائے صرف خوش نما الفاظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کابل میں مجھے "اسلامی حکومت"، "اسلامی شریعت کی فرمانروائی" اور "اسلامی اخوت" کا بڑا تلخ تجربہ ہوا۔ یعنی بچشم خود میں نے دیکھا کہ وہاں کس طرح "بادشاہِ اسلام" "سلطنتِ اسلام" اور "ملّتِ اسلامیہ" کے الفاظ کو عامۃ المسلمین کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا اور افغانستان کے خود بیں اور خود غرض رؤسا محض اپنی مطلب براری کے لئے "اسلام کی محبت" اور "اسلام کا غلبہ" کے دل خوش کن نعرے استعمال کر رہے تھے۔ مجھے سب سے پہلے افغانستان میں اس تلخ حقیقت کا تجربہ ہوا تھا کہ جب افغانی زعما (معدودے چند مستثنیات کے سوا) کے سامنے اسلام کا نام لیا جاتا تھا تو وہ بظاہر بہت جوش و خروش کا اظہار کرتے تھے مگر زیرِلب تبسم سے ہماری حماقت پر تعجب کرتے تھے اور ہمیں فرسودہ خیال لوگ سمجھ کر ہم پر حقارت کی نظر ڈالتے تھے کہ۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

اور عامۃ الناس کچھ اِن احکام کی چیرہ دستیوں کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ وہ اِس ظلم و ستم کو اسلامی حکومت کا خاصہ خیال کرتے تھے اور اِن تمام بدعنوانیوں کو جو امرا کی طرف سے ان پر ہوتی تھیں نہایت صبر و سکون سے برداشت کرتے تھے اور یہ کہہ کر اپنا دل بہلا لیتے تھے کہ "نوشتۂ تقدیر یونہی تھا"۔ "اللہ تعالیٰ

کی مرضی یونہی تھی کہ ہم ان مظالم کا تختہ مشق بنے رہیں۔" "جب اس کا حکم ہو گا تو یہ ظالم بادشاہ خود بخود درست ہو جائیں گے۔" وغیر ذلک۔ اس لئے کابل کے قیام نے مجھے اپنے اس عقیدہ میں اور بھی پختہ کر دیا تھا کہ مسلمانوں میں کوئی صحیح بیداری نہیں پیدا ہو سکتی جب تک کہ عامۃ الناس میں سیاسی اور اخلاقی شعور پیدا نہ کیا جائے گا اور وہ تعلیم سے آراستہ ہو کر اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے نہ لگیں گے۔

غرض کچھ اس قسم کے خیالات و عزائم کو لے کر میں غالباً جون ۱۹۲۶ء میں کابل سے فرار ہو کر نہایت دشوار گزار راستوں سے چھپ چھپا کر کنڑ میں پہنچا وہاں حضرت سید جمال الدین افغانی کے پوتے حضرت سید عبدالقادر صاحب عرف بادشاہ صاحب کنڑ کا مہمان ہوا۔ انھوں نے مجھے سینے سے لگایا اور کہا کہ "تم میرے بیٹے ہو۔ اور میری پناہ میں ہو۔ امیر حبیب اللہ کی مجال نہیں کہ تم پر دست درازی کر سکے" وغیر ذالک۔ کنڑ ایک نہایت زرخیز علاقہ ہے۔ خودرو میوہ دار درخت اور سبزہ نے اسے رشک جناں بنا دیا ہے۔ دریائے کنڑ کا پانی سونا اگلتا ہے اور اس کے چاروں طرف بسنے والے لوگ خوش حال اور آسودہ ہیں۔ کنڑ میں میں نے سب سے پہلے اپنا حلیہ تبدیل کیا یعنی سوٹ بوٹ اتار کر جبہ و دستار اور یاغستان کے ملاؤں کا لباس اختیار کیا۔

کنڑ اور یاغستان کے درمیان صرف ایک بلند پہاڑ حائل ہے جس پر میوؤں کے درخت اور سبزہ زار بکثرت ہیں۔ پہاڑ کی چڑھائی خاصی سخت ہے۔ یہی پہاڑ ڈیورنڈ لائن **(Durand Line)** کی سرحد ہے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈیورنڈ لائن اور یاغستان کے متعلق چند مزید معلومات پیش کر دی جائیں۔ کیونکہ ہمارے تمام انقلابی کام کا محور یہی علاقہ رہا ہے۔

انگریزی حکومت کے ہندستان میں قیام کے بعد اس کی افغانستان سے آئے دن چپقلش رہتی تھی۔ بالآخر انگریزوں نے امیر عبدالرحمٰن کو کابل کے تخت پر بٹھلایا اور ان سے معاہدہ کیا کہ وہ ہندستانی سرحدوں پر افغان قبائل کی یورش کی روک تھام کرتے رہیں گے اور اس کے صلے میں انہیں بارہ لاکھ سالانہ وظیفہ دینا منظور کیا۔ امیر عبدالرحمن مرحوم نہایت جابر بادشاہ تھے۔ انہوں نے افغانوں کی روح آزادی کچلنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا لیکن پھر بھی وہ ان حملوں کی کما حقہ روک تھام نہ کر سکے۔ ان حملوں کے نتیجہ کے طور پر ہمیشہ سرحدی تنازعات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ اس لئے انگریزوں نے ۱۸۹۳ء میں سر ہنری مارٹمر ڈیورنڈ کی سرکردگی میں ایک مشن کابل روانہ کیا تاکہ امیر صاحب کے ساتھ ہند اور کابل کی سرحدات کا تعین کرے۔ اس کمیشن نے افغانستان کی مشرقی اور جنوبی سرحدات کی تعین کی اس خط کا نام "ڈیورنڈ لائن" ہے۔ یہ لائن کنڑ کے پہاڑ سے شروع ہو کر درہ خیبر اور علی مسجد کے پہاڑ ڈکہ تک پھیلی ہوئی ہے اس معاہدے کی رو سے امیر کابل کا وظیفہ بھی بڑھا کر اٹھارہ لاکھ روپیہ سالانہ کر دیا گیا اور وہ تمام علاقہ جو یاغستان یا آزاد علاقہ کہلاتا تھا انگریزی حلقۂ اثر میں لے لیا گیا اور امیر افغانستان نے اس علاقہ سے دست برداری لکھدی۔ اس سے ایک طرف تو کوئٹہ اور بولان پاس Bolan Bass یعنی کوہاٹ و بہادرخیل کی حفاظت اور دوسری طرف پشاور، شب قدر اور ہشت نگر کے سرحدی علاقوں کو لوٹ مار سے محفوظ کرنا مقصود تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے اس علاقہ میں انگریزوں نے فوجی مورچے بنانے شروع کئے اور اپنی روایتی "برامن لنفوذ" کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے یاغستان کے ملکوں اور سرکردہ لوگوں کے وظائف مقرر کر دیئے اس شرط پر کہ وہ "نیک چلن" رہیں اور انگریزی استحکامات کوئٹہ، رزمک، چمن، شب قدر، وغیرہ پر حملہ نہ ہونے دیں گے۔ انگریزی حکومت

سالانہ دو کروڑ سے زائد روپیہ اس طرح خرچ کرتی تھی۔ اور جہاں کسی قبیلہ یا ملک نے "سرکشی" کا رجحان ظاہر کیا فوراً اس کا منہ سنہری لقمے سے بھر دیا جاتا تھا۔

یاغستانی بھی انگریزی حکمت عمل کو خوب سمجھتے تھے اور وہ آئے دن چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے تاکہ انگریزوں سے مزید مطالبات منواتے رہیں۔ انگریز بھی بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے اور ایک محکمۂ خاص اس غرض کے لئے قائم تھا۔ جس کی داد و دہش ہر قسم کی تنقیح سے بے نیاز تھی۔ غرض ہر سال یہ قبائلی معاہدہ شکنی کرتے تھے اور ہر سال صلح کرتے تھے اور مزید وظائف سے مالا مال ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام علاقہ اچاریوں اور لٹیروں کا مسکن بن گیا ان کی یہ عادتیں اس درجہ راسخ ہو چکی تھیں کہ اب وہ ایک دوسرے پر بھی ڈاکہ ڈالنے میں تامل نہ کرتے تھے۔ ڈاکوں وغیرہ کی وجہ سے ان میں عربوں کی رسم دشمنی بھی جاری ہو چکی تھی۔ اور اگر کسی قبیلہ کا آدمی مارا جاتا تو وہ تمام کا تمام قبیلہ اس کا قصاص لینا اپنا اخلاقی اور خاندانی فرض سمجھتا تھا۔ انگریزوں کی اس داد و دہش نے خود یاغستان کو بھی دو بالکل مختلف اور متضاد گروہوں میں بانٹ دیا تھا۔ جو طبقہ انگریزی اثر میں تھا وہ تو ہر قسم کی حقیقی اسلامیت سے عاری، اور لوٹ مار کا عادی ہو چکا تھا۔ دوسرا طبقہ جو انگریزی اثر و نفوذ سے باہر تھا اپنی اسلامی روایات پر نہایت سختی سے کاربند تھا۔ ان کی دیانت اور نیک چلنی ضرب المثل تھیں۔ یہ تفاوت اس قدر نمایاں تھا کہ شروع شروع میں مجھے حیرت ہوتی تھی۔

قصہ مختصر ہمارا قافلہ کنٹر کے پہاڑ کو عبور کر کے یاغستان یا آزاد علاقہ میں داخل ہوا۔ کنٹر کے ملحقہ علاقہ کا نام چمرکنڈ ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی اس پہاڑ کے یاغستانی طرف واقع ہے اور کوئی چار ہزار فٹ سطح سمندر سے بلند ہے بمشکل سو کے قریب گھر ہوں گے۔ بستی سے الگ ایک خاصی وسیع مسجد واقع ہے جو ملّا

باڈا صاحب کی مسجد کہلاتی ہے۔ اس کے ساتھ مجاہدین پنجاب کی بستی ہے۔ اس مسجد اور درگاہ کے متولی شیخ جمر کنڈ کہلاتے ہیں اور چونکہ وہ ملا صاحب باڈا کے جانشین سمجھے جاتے ہیں اس لئے قرب وجوار کے تمام علاقوں میں ان کی خاصی عزت ہے۔

ملا صاحب باڈا جنھیں انگریزوں نے "دیوانہ ملا" کا لقب دے رکھا تھا حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے خاص خلفاء میں سے تھے اور انہی سے انھیں شوق جہاد ورثہ میں ملا تھا۔ ان کی تمام عمر انگریزوں کے خلاف جہاد میں گزری تھی۔ جہاد ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ تمام عمر انگریز کے خلاف نفرت وحقارت کے بیج بوتے رہے اور قبائل کو لشکر کشی پر اکساتے رہے۔ میں نے اس خیال سے کہ ملا صاحب باڈا مرحوم ومغفور کی ساری زندگی اسی مقدس فریضے کی ادائی میں بسر ہوئی جس کو میں اپنا مقصد حیات بنا کر یاغستان آیا تھا وہیں ملا صاحب کی مسجد میں قیام کرنے اور یاغستان کے حالات کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ شیخ جمر کنڈ نے جو پرانی وضع کے بزرگ شخص تھے میرے لئے ایک حجرہ مخصوص کر دیا۔ شیخ ابراہیم مرحوم بھی میرے ساتھ مقیم ہو گئے۔ میں نے اپنے مجاہد بھائیوں کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے اپنا نام بدل کر "محمد سلیمان" رکھا۔ میرے ساتھ علاوہ شیخ ابراہیم مرحوم کے تین پنجابی طلبا بھی تھے۔ یہ مخلص نوجوان ان پندرہ مہاجر طلبا کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

کابل سے روانگی کے وقت ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں جرمن مشن کے اراکین۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم، ملا بشیر مرحوم اور بعض مہاجر طلبا شریک ہوئے تاکہ یاغستان کے متعلق ایک مفصل منصوبہ مرتب کر لیا جائے۔ جرمن وفد کی رائے تھی کہ مولانا سندھی مرحوم کو یاغستان چلے جانا اور وہاں کے تمام کام سنبھالنے چاہئیں۔ لیکن مولانا سندھی مرحوم نے صاف انکار کر دیا کہ میں

ایسے وحشی اور غیر متمدن علاقے میں جا کر قیام نہیں کر سکتا۔ البتہ کابل میں ہی رہ کر اِس تحریک کی قیادت سنبھال لوں گا لیکن ملا بشیر صاحب نے جو یاغستان کے حالات سے سب سے زیادہ واقف تھے کہا کہ تحریک کی قیادت اُس شخص کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے جو خود وہیں اقامت اختیار کرے کیوں کہ لڑائی میں ہمیشہ قضیہ زمین بر سر زمین ہوا کرتا ہے۔ غرض بہت رد و کد کے بعد اس بات پر سب کا اتفاق ہو گیا کہ میں یاغستان کی تحریک کی قیادت ایک وقت تک سنبھال لوں اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم صدر مدرس دیوبند کو دعوت دی جائے کہ وہ یاغستان آکر اِس تمام تحریک کی قیادت کی عنان سنبھال لیں۔ حضرت شیخ الہند کا اثر یاغستان میں مسلم تھا کیونکہ وہاں کے اکثر ملا اور آئمہ مساجد ان کے شاگرد تھے۔

غرض میں، شیخ محمد ابراہیم، چند مہاجر طالب علم کابل سے نکل کر یاغستان پہنچے اور ملّا باڈا صاحب کی مسجد کے زیر سایہ مقیم ہو گئے۔ یاغستان کے اِس علاقے میں جہاں میں نے اپنا مستقر بنایا تین بڑے اور صاحب اثر ملّا تھے جن میں سے ہر ایک اپنے اقتدار کا خواہاں تھا اور ایک دوسرے سے تعاون کو اپنی کسر شان اور ہتک سمجھتا تھا۔ یہ ملّا حاجی صاحب ترنگزائی، ملّا صاحب باڑا اور سنڈا کے ملا صاحب تھے۔ مگر یہ تینوں ملّا صاحب ہاڈا کے مریدوں میں سے تھے یا ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ اور اس عقیدت کی وجہ سے شیخ چمر کنڈ کو جو ملا صاحب کے سجادہ نشین سمجھے جاتے تھے۔ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یوں بھی شیخ چمر کنڈ بالکل مرنجان مرنج قسم کے انسان تھے۔ جنھیں علو یا لیڈری کی ہوس نہ تھی، اس لئے چمر کنڈ میں میرا قیام بہت مناسب رہا۔ اور تینوں بڑے ملا صاحبان نے مجھے غیر جانبدار انگریزی خواں عالم تصور کیا اور میری آمد کو کسی خاص خطرے کے ساتھ منسوب نہ کیا۔ بلکہ میرے آنے سے پہلے ہی یاغستان میں میری شہرت پہنچ چکی تھی اور وہ یہ کہ "لوئے مولوی" یعنی بڑا

NEW DELHI

6953

مولوی (پرنسپل) کابل سے بھاگ کر قبائل میں آگیا ہے۔ اس لئے جونہی میں پہنچا تو دور و نزدیک سے لوگ مجھے دیکھنے کے لئے جوق در جوق آنے لگے۔ اِس ضمن میں بعض لطیفے مشاہدہ میں آئے۔ مثلاً ایک دن میں صحن مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بڈھا آیا اور نہایت تعجب سے پکار اٹھا کہ "واہ تیری قدرت یہ لوئے مولوی بھی تو ہماری طرح کا انسان ہی ہے"۔ ایک دن ایک بڈھا اپنے فرزند کے ساتھ میری زیارت کے لئے آیا۔ لڑکے نے مجھے دیکھتے ہی کہا "کہ بابا دیکھو لوئے مولوی کی چار آنکھیں ہیں (میں عینک لگایا کرتا تھا) دو اصلی اور دو شیشے کی"۔ باپ بہت عقلمند تھا۔ کہنے لگا نہیں بیٹا یہ لوئے مولوی اندھا ہے۔ شیشے کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور یہ فرنگی کا کمال ہے"۔ میں فارسی میں گفتگو کرتا تھا اور ترجمان پشتو میں ترجمہ کرتا تھا۔ اب یہ سیدھے سادے لوگ آتے اور حیرت سے پوچھتے کہ" ہیں یہ لوئے مولوی کیسا ہے پشتو نہیں جانتا"۔ ان کے خیال میں کسی عالم کے لئے اور بالخصوص "بڑے عالم" کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ پشتو نہ جانے۔ چنانچہ ہمارے ترجمان نے یہ کہہ کر کہ لوئے مولوی صاحب "کتابی پشتو میں بات چیت کرتے ہیں جو تم لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے"۔ ان کی تسلی کی اور ایک بڈھے نے کہا کہ "ہاں اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے"۔

یاغستان کے جغرافیائی محل وقوع نے اس کی سیاسی اہمیت بہت بڑھا دی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے انگریز اپنی پُرامن نفوذ کی پالیسی کو قریباً ترک کر چکا تھا۔ نفوذ کی بجائے صرف وظائف کا زور تھا۔ خود ہندوستان کی تمام فوجیں فرانس جا چکی تھیں اور ہندوستان جیسا وسیع و عریض ملک اسلحہ سے اور سامانِ حرب اور انگریزی و ہندوستانی فوجوں سے قریباً خالی ہو چکا تھا۔ یاغستان کے جنگجو لوگ نہ صرف جنگ کے خوگر تھے۔ بلکہ کافر کے خلاف جہاد ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اودھر انگریزی کی یہ حالت تھی کہ ذرا سے حملہ کے اندیشہ سے وہ اس قدر خائف ہو جاتا کہ

لاکھوں روپیہ صرف کردینا اس کے لئے معمولی بات تھی۔ ہم نے کابل ہیں یہی پروگرام مرتب کیا تھا کہ یاغستان کو انگریزوں سے توڑ کر امیر کابل سے جوڑا جائے اور امیر صاحب کی وساطت سے انھیں مسلح اور منظم کرکے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے فوج تیار کی جائے۔ یاغستانیوں کے فوجی اوصاف اوران کی جنگی روایات اس بات کی شہادت دیتی تھیں کہ یہ لوگ ہندوستان سے کفر کو نابود کرے نیز اسلام کا قوی بازو ثابت ہوں گے۔

سکیم تو مکمل تھی مگراس کی مثال شہزادے کے بغیر ہیملٹ کے ڈراما کی تھی۔ اور بعد میں ہمیں یقین ہوگیا کہ امیر حبیب اللہ کی بزدلی' ان کی انگریزوں سے مرعوبیت کسی جرأت مندانہ تجویز کو بروئے کار لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ یہاں یہ عرض کردینا تحصیل حاصل ہے کہ یہ سارا منصوبہ افغان دماغ کی فکر کا نتیجہ نہ تھا' کیونکہ افغان دماغ تو اس قسم کی دوراندیشی سے کوسوں دُور تھا اور ہے اس کی تہی دامنی کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا مل سکتا ہے کہ اب جبکہ حالات بالکل الٹ چکے ہیں اور انگریزوں کے بجائے خود مسلمان جو سکیم کے مجوز تھے پاکستان کے مالک بن چکے ہیں اور یاغستان کا اصلی مقصد کہ مسلمان اپنے حاکم ہوں حاصل ہو چکا ہے' افغان وہی پرانا ڈھول پیٹ رہے ہیں اور ہندوؤں کی رضاجوئی کے لئے وہ کام کر رہے ہیں جو انھیں نہ کرنا چاہیئے۔

قصہ کوتاہ ہم ایک مکمل سکیم لے کر یاغستان میں داخل ہوئے تھے اور وہاں پہنچتے ہی ہم نے اسے کامیاب بنانے کی تدبیر شروع کی۔ کوشش یہ تھی کہ یاغستان کو منظم و مربوط کرکے انگریزوں کے خلاف پشاور سے کوئٹہ تک بہ یک وقت گوریلا لڑائی شروع کردی جائے اوران کی فوجوں کو مصروف رکھا جائے' یہاں تک کہ امیر افغانستان باقاعدہ لشکر کشی کرکے ہندوستان کو ہوم رول دینے کا اعلان کردیں۔

اِس منصوبے کی کے لئے سب سے پہلا قدم یاغستانی ملاؤں کا اتحاد عمل تھا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے اسی طرف قدم اٹھایا اور پہلے حاجی صاحب ترنگزائی کی دعوت قبول کرلی۔ چنانچہ ۲۹ رمضان کو چمرکنڈ سے حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ میرے ساتھ ملا بشیر، شیخ ابراہیم اور دوسرے ہمراہی تھے۔ حاجی صاحب نے نہایت پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ان کے صاحبزادے "بادشاہ گل نے (جو آج کل ان کے جانشین ہیں اور غالباً پشاور میں مقیم ہیں) ہمارا استقبال کیا۔ شام کو افطار کے بعد آیندہ طریق کار کے متعلق بڑی مفصل گفتگو ہوتی رہی۔ حاجی صاحب ایک اَن پڑھ مگر نہایت سمجھدار اور دوراندیش بزرگ تھے باوجود پیرانہ سالی کے جہاد کے جوش میں گھر بار چھوڑ کر یہاں ایک جنگل میں آکر جم گئے تھے۔ حاجی صاحب ہشت نگر ضلع پشاور کے بہت بڑے پیر تھے اور سرکار انگریزی کے ہاں کرسی نشین تھے۔ مگر جونہی انگریزوں نے ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ان کی رگِ حمیت بھڑک اٹھی اور فوراً ہجرت کر کے یاغستان چلے گئے اور وہاں جہاد کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ان کی آمد سے یاغستان میں دوسرے ملاؤں کا چوکنا ہونا ایک قدرتی امر تھا کیونکہ یہ بھی ان کے پائے کے پیر تھے اور ان کے مریدین کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ اس لئے حاجی صاحب کے یاغستان میں آکر جم جانے سے اِس امر کا خطرہ تھا کہ ان کا ایک مدمقابل پیر پیدا ہو گیا ہے لیکن میں یہاں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اِن لوگوں میں گو علم نہیں تھا مگر صحیح اسلامیت تھی۔ یہ ملا ہاڈا صاحب اور حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فیوضات کا اثر تھا کہ ان کی مخالفت علانیہ نہ تھی اور نہ اصول جہاد سے اعراض کی وجہ سے تھی۔ اِس بات نے ان کا اتحاد ممکن کر دیا تھا۔

میں نے چمرکنڈ میں داخل ہوتے ہی اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب چونکہ بظاہر حالات مجھے اپنی بقیہ زندگی انہی بدو لوگوں میں بسر کرنی ہے۔ اس لئے اِن

لوگوں کا تمدن اور رہن سہن کا طریق اختیار کر لینا چاہیے تاکہ ان لوگوں کو اجنبیت نہ محسوس ہو اور میں بھی ان سے اجنبیت محسوس نہ کروں۔ چنانچہ پہلے دن جب ہمارا قافلہ چمرکنڈ پہنچا اور جماعت مجاہدین کے کیمپ میں شیخ چمرکنڈ کے مہمان کے طور پر اترا تو پٹھانی دستور کے مطابق شیخ چمرکنڈ نے رات کو ہماری "بڑی شاندار" دعوت کی۔ وہ دعوت خالص افغانی طرز کی تھی۔ اس میں چمرکنڈ کے تمام شیوخ شریک تھے۔ ایک دنبہ ذبح کیا گیا اور اسے دیہاتی طریق پر پکایا گیا۔ کھانے کے وقت ایک بہت بڑا چوبی لگن لاکر بیچ میں رکھ دیا گیا جو شوربے سے قریباً بھرا ہوا تھا۔ اب شیخ چمرکنڈ نے اس میں تندوری روٹیاں توڑ کر بھگونی شروع کر دیں اور ایک قسم کا "ثرید" تیار ہو گیا۔ ہم سب بیس پچیس ۲۵ مہمان اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ روٹی کا ایک ایک ٹکڑا اور گوشت کا بوٹا رکھ کر کہا گیا کہ بسم اللہ کرو۔ پٹھان مہمانوں نے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ اس لگن میں ہاتھ ڈال کر کھانا شروع کیا۔ میرے ساتھی رُکے۔ کیونکہ وہ الگ الگ پلیٹوں میں کھانے کے عادی تھے اس لئے ایک ہی برتن میں سے سب کے ساتھ کھانا انھیں ناگوار گذرا۔ مگر میں نے بلا تامل اس لگن میں سے کھانا شروع کر دیا اور اردو میں اپنے دوستوں سے کہا کہ اب تو ہمارا مرنا جینا انھیں لوگوں کے ساتھ ہے اس لئے ہندوستان اور کابل کی رہن اور وہاں کے طور طریق کو بھول جاؤ۔ غیر میرے کہنے پر ان لوگوں نے باولِ نخواستہ چند لقمے کھائے مگر میں نے دیکھا کہ پٹھان مہمانوں نے ان کی بد دلی اور میری رغبت کو بھانپ لیا۔ قصہ مختصر میں نے اپنا طور طریقہ اس قدر بدل لیا کہ کوئی شخص مجھے دیکھ کر یہ باور نہیں کر سکتا تھا۔ کہ میں قبائلی زندگی کا عادی نہیں۔ اس چیز نے مجھے حاجی صاحب کے ہاں بھی بہت مقبول بنا دیا۔ حاجی صاحب بار بار یہی فرماتے تھے کہ یہ تو میرا بیٹا ہے۔ دیکھو کیسا اپنے گھر کی طرح سب سے ہل مل گیا ہے۔

دوسرے دن یعنی عید کی نماز پر بہت بڑا مجمع ہونے والا تھا۔ علاوہ دیہاتی

نمازیوں کے ارد گرد کے دیہات کے سب لوگ جن کی تعداد پانصد سے زائد تھی جمع ہوئے تاکہ میری تقریر سنیں اور جو تجویز میں جرمن مشن کے مشورے سے طے کرکے آیا تھا اس کی تفصیلات سے آگاہی حاصل کریں۔ حاجی صاحب نے یہ فیصلہ فرمادیا تھا کہ عید کی نماز بھی میں پڑھاؤں اور اس کے بعد وعظ بھی کہوں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ رات بڑے اضطراب سے کٹی کیوں کہ میں محسوس کر رہا تھا کہ یاغستان میں یہ میرا پہلا قدم تھا اور بہت کچھ اس کی کامیابی پر میرے مشن کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار تھا۔ یہ بھی ہمیں معلوم ہوا کہ انگریزوں نے اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ میرے مشن کو ناکام بنائیں اور یاغستان میں اتحاد نہ ہونے دیں۔

عید کی نماز کے وقت غیر معمولی مجمع تھا۔ شیوخ و خوانین کے علاوہ جو خاص طور پر مدعو تھے لوگ بہت بڑی تعداد میں میلوں چل کر "لوئے مولوی" کی پہلی عام تقریر کو سننے آئے تھے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں انگریز کے خلاف بولوں گا۔ میری تقریر اُردو میں تھی اور ترجمان مولوی فضل محمود مرحوم تھے۔ مولوی صاحب دیوبند کے فارغ التحصیل اور حاجی صاحب کے خاص آدمی تھے۔ ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ اور وہی میرے سب سے اچھے ترجمان ثابت ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے قرآن حکیم کی مشہور آیت۔

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله۔

"تم لوگوں میں سے بہترین امت پیدا کئے گئے ہو۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔"

سے تقریر شروع کی جو دو گھنٹے جاری رہی۔ لوگوں پر اس کا بہت زیادہ اثر ہوا اور اس کا اظہار اس طرح بھی ہوا کہ چار دفعہ مجھ سے درخواست کی گئی کہ "ذرا ٹھیریئے"

میرے رکنے پر ایک بوڑھا ملک کھڑا ہوتا اور کہتا کہ "مولوی صاحب کے لیے دعائے خیر کرو کہ خدا انھیں نظرِ بد سے بچائے" غرض تقریر نے وہی کام کیا جو مٹی کے تیل پر دیا سلائی کرتی ہے۔ لوگوں کی آتشِ انتقام بھڑک اٹھی اور بہت سے لوگوں نے تلواریں نیام سے نکال لیں اور زور زور سے کہنے لگے کہ "مولوی صاحب! حکم دیجیے تاکہ ہم اس ..... فرنگی کا سر قلم کر دیں" تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ تاریخ میں صلیبی لڑائیوں کے وقت سے لے کر اب تک انگریز ہمیشہ مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہے ہیں۔ انہی نے افریقہ کو ہمارے ہاتھوں سے چھینا، ہندستان کا وسیع و عریض ملک مسلمانوں سے لے لیا اور اب ٹرکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے اس کے حصے بخرے کرنا چاہتے ہیں، اور اسلام کی آخری ٹمٹماتی ہوئی شمع کو بھی بجھانے کے درپے ہیں۔ اس لئے ہر مومن صادق کا فرض ہے کہ ہر ممکن طریق پر انگریزی استعمار کے خلاف صف آرا ہو۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے خود متحد ہو جائیں۔ انگریز کی حکمتِ عملی یہی رہی ہے کہ وہ ہمیشہ ہم میں پھوٹ ڈلوا کر خود ہمارے ہاتھوں، ہمیں تباہ کرتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے اختلافات ختم کر کے انگریز کے خلاف متحد ہو جائیں۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ تمام افغان قبائل کو امیرِ افغانستان کے جھنڈے تلے جمع کر کے انگریزوں کے خلاف چڑھائی کروں اور ہندستان پر پھر ایک دفعہ ہلال کا جھنڈا لہرانے لگے۔

تقریر ختم ہوئی تو احسنت، مرحبا کا شور اٹھا۔ تمام لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر میری درازیٔ عمر کی دعا کی اور بالاتفاق کہا مجھے امیرِ جہاد مقرر کیا جائے۔ اس پر میں نے کہا کہ میں آپ کی عزت افزائی کا بہت مشکور ہوں لیکن حاجی صاحب اور ملّا صاحب ہاڑا اور سنڈا کے ملا صاحب جیسے آزمودہ کار مجاہدین کے ہوتے ہوئے میں اپنے میں یہ جرأت نہیں پاتا کہ میں امیر بنوں۔ میری تجویز یہ ہے کہ آپ

لوگ اپنے اپنے حلقے کا الگ الگ امیر جہاد مقرر کرلیں۔ آپ کے حلقے کے لئے میں جناب حاجی صاحب ترنگزائی کا نام نامی تجویز کرتا ہوں اور باجوڑ کے علاقہ میں جناب ملا صاحب کا صوات کے علاقہ کے لئے سنڈاکے ملا صاحب کا۔ سب لوگوں نے بالاتفاق اس تجویز کو پسند کیا اور وہاں کے ملوک و شیوخ اور عامۃ الناس نے حاجی صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعتِ جہاد کی۔ وہ نظارہ ایسا ناقابلِ فراموش تھا کہ اس کی گرمی اور جوش مجھے اب تک یاد ہیں۔ اور میں کئی دفعہ اپنے ذہن میں اس یاد کو تازہ کر کے سوچتا ہوں کہ مسلمان میں اب بھی اسلام کے نام پر قربان ہونے کا کس قدر ولولہ موجود ہے، مگر افسوس کہ ہمارے پیشوا اور اکابر خود روحِ جہاد سے بیگانہ ہیں، اس سے کام لینا ہی نہیں جانتے۔

میری تقریر کیا تھی، ایک طرف تو "انا نذیر خریاں" کا اعلان تھا۔ دوسری طرف انگریز نے اسے اپنے خلاف اعلانِ جنگ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ اب محض روپیہ سے یہ آگ فرو نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ انھوں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ مجھے اشتہاری مجرم قرار دے کر میرے قتل یا گرفتاری کا انعام دس ہزار روپیہ مقرر کیا۔ اور میرے گھر سے (یعنی قصور سے) میرے فوٹو لے کر انھیں اشتہاروں پر چسپاں کر دیا۔ لیکن خدا کی شان کہ جس قدر انگریز میری مخالفت اور سرکوبی میں سر توڑ کوشش کرتا تھا اسی قدر میری مقبولیت قبائلی علاقہ میں بڑھ رہی تھی اور میں بے خطر تمام علاقہ میں پھرنے لگا۔ اور تبلیغ جہاد میں مصروف ہو گیا۔

اس تقریر کے بعد میں واپس چمرکنڈ گیا اور قبائل کی تنظیم کی۔ سب سے پہلے میں نے ایک ملٹری ٹریننگ اسکول جاری کیا۔ اس میں قبائلیوں اور مجاہدین کو جن کی تعداد سو کے قریب تھی قواعد سکھلائی اور نشانہ بازی کی مشق شروع کی۔ اس

کے ساتھ ساتھ نوجوان لڑکوں کو آفتاب کی روشنی میں آئینہ سے بات چیت سکھلانی شروع کی۔ ایک پرائمری اسکول جاری کیا جس میں علاوہ دنیوی تعلیم کے دینی تعلیم اور لوگوں کو کتاب وسنت سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے ایک دیہاتی ڈسپنسری بھی قائم کردی اور دیہاتی مریضوں کا علاج بھی شروع کر دیا۔ دیہاتیوں میں تہذیب وتمدن کی بیماریاں نہیں ہوتیں کہ ان کی تشخیص کے لئے کسی ماہر ڈاکٹر کی ضرورت ہو۔ میں بہت تھوڑی مشق اور تجربہ کے بعد اچھا خاصا نیم حکیم بن گیا۔ دراصل ان لوگوں کو مجھ پر اس قدر حسن ظن ہو گیا تھا کہ میری قابلیت سے زیادہ ان کی خوش اعتقادی میرے کام آتی تھی۔ ان لوگوں کی سادگی اور سادہ مزاجی واقعی قابلِ رشک تھی۔ ان کی لاعلمی بھی واقعی انگریزی کی مشہور ضرب المثل کے مطابق ان کے لئے باعثِ رحمت تھی۔ وہ لوگ دغل وفریب سے، جھوٹ، ریاکاری تصنع اور ان تمام برائیوں سے جنھیں ہم لوگ تہذیب کا لازمہ خیال کرتے ہیں بالکل ناآشنا تھے۔ بقول حالی۔

رہی اپنی فطرت پہ طبع بشر تھی

میری دعوت جہاد آگ کی طرح پھیل گئی اور مختلف دیہاتوں سے میرے پاس وفود آنے لگے، یہ اپنے اپنے گاؤں کی طرف سے بیعت جہاد کرتے تھے اور ہدایات لے کر واپس چلے جاتے تھے۔ میرے ساتھیوں کی آتش بیانی سے ہر طرف جہاد کا غلغلہ بلند ہو گیا۔ اس مصروفیت کے ساتھ ساتھ قبائلیوں کو مصروفِ جہاد رکھنے کے لئے ہم نے یہ ترکیب کی کہ پشاور کی سرحد پر مسلسل ڈاکے ڈلوانے شروع کئے۔ ان سے ہمیں ایک تو کافی مال غنیمت مل جاتا تھا دوسرے لوگوں کی دشمنی انگریز سے دن رات المضاعف ہوتی تھی۔ مجھے خود جب بندوق کی ضرورت ہوئی تو میں وہاں کی ساختہ دیسی بندوق کی بجائے انگریزی رائفل خریدنا چاہتا تھا۔

دوستوں نے کہا کہ بہترین بندوق نہایت آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ اور اس کی ترکیب یہ ہے کہ کسی انگریزی مہینے کے آخری ایام میں چھاؤنی سے خرید کرلی جائے کیونکہ جب گورہ محافظوں کے پاس شراب خریدنے کے لئے پیسے نہیں رہتے تو وہ بہترین بندوقیں اور کارتوس کوڑیوں کے دام فروخت کرکے اپنی شراب کی طلب کو پورا کرتے ہیں۔ چنانچہ صرف گیارہ روپے میں مجھے ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی میگزین رائفل جو غالباً کسی فوجی افسر کی تھی مل گئی۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ وہاں ایک اچھی خاصی تعداد ان بہترین انگریزی رائفلوں کی تھی جو اس طرح حاصل کی گئی تھیں۔

واضح رہے کہ ہم اس طریق کار کے موجد نہیں تھے۔ ڈاکوں کے وہ لوگ ایسے ماہر تھے کہ یہ ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ مگر ہوا یہ کہ جنگ کے دوران میں انگریز نے اپنی سرحدات کو مامون کرنے کے لئے بے دریغ روپیہ صرف کرکے ان ڈاکوں کو عارضی طور پر بند کروا لیا تھا۔ ہم نے جا کر اس مہر سکوت کو توڑ دیا اور نئے سرے سے ڈاکے ڈلوانے شروع کر دئے یہ گویا اس امر کا اعلان تھا کہ عارضی صلح (Truce) کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

اب میرے پاس بفضلہ کافی سرگرم اور جوشیلے نوجوان جمع ہو چکے تھے جن میں سے ہر ایک انقلابی روح سے سرشار تھا۔ ہر انقلابی تحریک کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ جب وہ ایک دفعہ جڑ پکڑ لیتی ہے تو پھر آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہمارے مبلغین ہر گاؤں میں پہنچتے۔ لوگوں کو جمع کرتے انھیں انگریز کے خلاف دعوت جہاد دیتے اور انگریزی حکومت کی جگہ اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے قیام کی تبلیغ کرتے۔ لوگ جوق در جوق بیعت کرتے اور جو لوگ اس بیعت میں شریک نہ ہوتے ان کے گھر بار جلانے کا فیصلہ کرتے چنانچہ بہت سے لوگوں کے گھر

جلا دئے گئے جو انگریز کی دوستی کی وجہ سے پشاور یا ملحقہ علاقہ میں چلے گئے تھے۔ وہاں ہم نے یہ دیکھا کہ گاؤں کی پنچایت کے فیصلے کی اطاعت حیرت انگیز طریقے پر کی جاتی تھی۔ جب پنچایت یہ فیصلہ کر دیتی تھی کہ فلاں شخص جہاد سے گریز کرتا ہے تو اس کے کسی عزیز یا رشتہ دار کی یہ مجال نہ ہو سکتی تھی کہ اس کی طرف سے جھگڑا کرے یا کوئی عذر معذرت کرے بلکہ خود اس شخص کے اعزا جا کر اس کے گھر کو آگ لگا دیتے تھے۔

ہماری اس تحریک کو جرمن فتوحات کی خبروں نے اور تقویت دی۔ سول اور پائنیر ہمارے پاس روزانہ پہنچتے تھے اور لوگ مزے لے لے کر انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کی پسپائی کے واقعات پڑھتے اور ان پر سر دھنتے تھے بقول اکبر مرحوم

پرسیں بیورو کی خبروں سے پتہ اتنا تو چلتا ہے
فتح انگلش کی ہوتی ہے قدم جرمن کا بڑھتا ہے

سول اور پائنیر کے علاوہ الہلال اور زمیندار بھی شروع شروع میں ہمارے پاس پہنچتے تھے۔ گو وہ تھوڑے عرصے کے بعد بند کر دئیے گئے تھے۔ لیکن اس عرصے میں بھی وہ ہمارے لئے خاصی رونق اور گرمی محفل کا سامان بن گئے تھے۔ ان کے مضامین اور تنقیدی شذرے کبھی بھی باسی نہ ہوتے تھے۔ ہم سب کو اس وقت یقین ہو چلا تھا کہ انگریزی نظام جرمن ضربوں کی تاب نہ لا کر دھڑام سے گرنے والا ہے۔ اور انگریزی اخباروں کے تسلی آمیز مضامین کی حقیقت اکبر مرحوم کے الفاظ میں یہ تھی کہ۔

گھر سے آیا ہے یہ خط ہو گیا چہلم ان کا
پائنیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

اب لوگوں کے دلوں سے انگریز کا رعب اٹھتا جاتا تھا اور جو پہلے متذبذب تھے وہ بھی ہمہ تن ہمارے ساتھ آ شریک ہوئے اب ہماری تحریک اپنے پورے

شباب پر تھی اس لئے میں چند دن کے لئے ڈمر کرنے سے غیر حاضر رہ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے ملا صاحب باڑہ کی دعوت کو قبول کر لیا۔

چمرکنڈ کی وادی جہاں میں نے اپنا مستقر بنایا تھا، نہایت سرسبز وادی تھی، چشمے اور سبزہ زار، ٹھنڈی ہوائیں، لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اسے رشکِ کشمیر بناتی تھیں۔ لوگوں کی سادہ زندگی تھی اور ان کی مادی ضروریات سب وہاں پیدا ہوتی تھیں۔ چینی، چائے، مصالحہ، دیا سلائی، کپڑا، دوائیں ہندستان سے جاتی تھیں اور ان چیزوں کی باقاعدہ تجارت ہوتی تھی۔ اس وادی سے وہ لوگ شہد، انڈے، مرغیاں، گھی، چاول، گل بنفشہ، نیلوفر، عناب، سپستان وغیرہ بکثرت ہندستان لاتے تھے اور بتادلۂ اجناس سے اچھی خاصی تجارت ہوتی تھی۔ مگر یہ عام تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ قبائلی علاقہ میں ہندو بالکل محفوظ تھا اور اس کی جان، مال، عزت، آبرو ہر چیز کا سارا قبیلہ ضامن ہوتا تھا۔ چمرکنڈ سے ملا صاحب باڑا کا مستقر شاید کوئی تیس میل ہوگا۔ آمد و رفت کے لئے سڑکیں یا شاہراہیں موجود نہ تھیں۔ مگر وہ لوگ اس قدر محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں کہ ایک دن میں تیس چالیس میل پیدل سفر کر لینا ان کے لئے بالکل معمولی بات ہے۔ چنانچہ جب میں چمرکنڈ سے ملا باڑا کی طرف نکلا تو میری سواری کے لئے ایک نہایت عمدہ گھوڑا تھا۔ اسی طرح ملا بشیر صاحب بھی گھوڑے پر سوار تھے مگر باقی ہمراہی پیدل چل رہے تھے۔ گھوڑا بھی ان پگڈنڈیوں پر قدم قدم ہی چل سکتا ہے۔ اس لئے ہم سب صبح نماز فجر سے پہلے نکل کر قریباً عصر کے بعد ملا صاحب کے مستقر پر پہنچ گئے۔ ملا صاحب کا مستقر ایسا پر فضا مقام تھا کہ چمرکنڈ بھی اس کے سامنے گرد تھا۔ میں نے کشمیر، یورپ کے اکثر پہاڑی مقامات اور ہندستان کے اکثر بڑے بڑے پہاڑ دیکھے ہیں لیکن ملا صاحب کا مستقر جسے باڑا کہتے ہیں، کسی طرح قدرتی خوبصورتی، سبزہ زار، حسین مناظر اور دلکش جھولوں کی افراط میں ان سے کم نہ تھا۔

ہیلوں قدرتی چشمے نہروں کی صورت میں نہ صرف پینے کا شفاف و شیریں پانی مہیا کرتے ہیں بلکہ کھیتوں کو سیراب بھی کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے کناروں پر دُور دُور تک دھان اور مکی کے کھیت آنکھوں کو طراوت اور دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی دور تک کھیتیاں ہی کھیتیاں لہلہا رہی تھیں۔ وہاں میں نے ایک عجیب بات دیکھی کہ زمیندار اور کاشتکار کی کوئی تمیز نہ تھی۔ کاشتکار ہی عموماً اپنی کھیتیوں کے مالک و مختار ہوتے تھے اور آمد و رفت کے ذرائع کی کمی کے باعث وبیرونی تمدن کے تباہ کن اثرات سے بالکل پاک تھے۔ ایسی نیچرل زندگی نے اِن میں خودداری غیرت اور شجاعت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ لوگ جھوٹ سے ناآشنا تھے۔ گو ان میں ہمارا شہری قسم کا پردہ نہ تھا مگر مخلوط سوسائٹی کا نام و نشاں تک نہ تھا۔ عورتیں حیا کا پتلا نہایت اطمینان سے سفر کرتی ہیں اور خوبصورت سے خوبصورت عورت بھی تنہا بے خطر آتی جاتی ہے اور کسی شخص کی مجال نہیں کہ اُسے چھیڑے یا کوئی آوازہ کسے۔ نہیں۔ بلکہ کوئی مرد ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ہم نے بارہا دیکھا کہ سامنے سے ایک نوجوان عورت اکیلی آرہی ہے۔ مرد راستہ چھوڑ کر الگ ہو گئے اور وہ چپکے سے گزر گئی۔

اِس اقتصادی خود مختاری نے وہاں عجیب طرز زندگی کو جنم دیا ہے۔ اِن میں نہ تو کوئی پولس ہے، نہ کوئی حاکم، نہ کوئی بادشاہ یا ملک، نہ ٹیکس ہے نہ محصل۔ نہ خراج ہے نہ زور و ظلم۔ وہ نہ خود کسی کی عزت و آبرو، مال و منال پر ہاتھ ڈالتے ہیں نہ وہ اِس امر کو برداشت کرتے ہیں کہ کوئی ان کی عزت و آبرو اور مال و منال پر ہاتھ ڈالے۔ ان میں امیر و غریب زمین دار کاشتکار وغیرہ کا کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ ان پر صرف ایک حاکم ہے۔ وہ ان کی پنچایت اور پنچایت کا صدر ملّا ہوتا ہے وہ شریعت اسلامی کے مطابق حکومت کرتا ہے۔ حکومت کا لفظ بھی شاید صحیح نہ ہوگا۔ ملّا صاحب کا اصل کام

یہ ہے کہ وہ اسلامی اجتماعی عدل و مساوات کو قائم رکھیں۔ پولیس کے ڈنڈے کے زور سے نہیں بلکہ لوگوں کے اسلامی محبت کے جذبے سے۔ اِن لوگوں میں یہ فطری مادہ ہے کہ جہاں مذہب کا نام آیا وہ خود جھک گئے۔ باپ بیٹے کی پرواہ نہیں کرے گا۔ بھائی بھائی کی رعایت نہیں کرے گا۔ غرض ایک حیرت انگیز معاشرت تھی جو ہر قسم کی طبقاتی کشمکش سے بری تھی۔ تجارت تمام و کمال ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ مگر ان میں اور ہندوستان کے بنیوں میں بھی نمایاں فرق ہے۔

پنچایت وہاں کوئی مستقل ادارہ نہیں ہے جو حکومت کا قائم مقام ہو۔ بلکہ وہ بغیر انتخاب کے خود بخود وجود میں آجاتی ہے۔ ہر بڑا بوڑھا اس کے اجلاس میں آکر بیٹھ جاتا ہے اور نہایت آزادی سے رائے دیتا ہے۔ یہ پنچایت ہمیشہ کسی خاص سانحہ کے وقت وجود میں آتی ہے اور ملا صاحب اس کے صدر کے طور پر تشریف لے آتے ہیں۔ ملا صاحب بھی لوگوں کی داد و دہش کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ ان کی اپنی زمین ہوتی ہے۔ وہ بھی یا تو خود کھیتی باڑی کرتے یا کراتے ہیں۔ ملا صاحب کے پاس عموماً ایک نہ ایک عالم دین ہوتا ہے جو جمعہ و عیدین کا خطبہ، نکاح، نماز، جنازہ وغیرہ کی مذہبی رسومات کی اقتدا کرتا ہے۔ اور وقت ضرورت شریعت کے احکام کی توضیح بھی کر دیتا ہے۔ شریعت کی فرمانبرداری ایسی مطلق ہے کہ جہاں مولوی صاحب نے کوئی فتوے دے دیا وہیں سب کی گردنیں خم ہو گئیں۔ شریعت کی اِس اطاعت کو دیکھ کر انارکسٹوں کی "لاحکومت" کی خیالی جنت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

آمدیم بر سر مطلب ہم عصر کے وقت یا اس سے تھوڑی دیر بعد ملا صاحب کے مستقر پر پہنچے۔ ملا صاحب خود بنفسِ نفیس استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر گلے لگایا۔ پیار کیا اور خالص افغانی طریق پر میری مزاج پرسی کی۔ وہاں مہمان عزیز کے ماتھے پر بوسہ دیا جاتا ہے۔ جسے میں نے "پیار کرنا" سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ

حاجی صاحب ترنگزئی سے ملا صاحب باڑا کا حلقہ اثر زیادہ وسیع تھا اس لئے وہاں ملوک اور خوانین کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ وہ سب میرے استقبال اور جہاد کی تدابیر سننے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ ملا صاحب نے میرے اعزاز میں شاندار دعوت کی۔ ایک دنبہ ذبح کیا اور اُسے افغان طریق پر سالم پکوایا گیا۔ مسلّم دنبہ کا گوشت نہایت لذیذ اور خستہ ہوتا ہے۔ دنبہ کے علاوہ مسلّم مرغ، بھنے ہوئے تیتر، دہی، شہد، مکھن اور پنیر وغیرہ بھی تھے۔ نہایت عمدہ تنوری پراٹھے ساتھ تھے۔ رات کو آرام کرنے کے بعد صبح سویرے نماز کے بعد میں ملا صاحب کی وادی کی سیر کے لئے نکلا۔ وادی کیا تھی۔ رشکِ کشمیر جنّت نظیر تھی۔ آب و ہوا وہاں کی ایسی روح پرور اور صحت افزا تھی کہ بقول عرفی :-

گر مرغ کباب است کہ بابال و پر آید

چشموں کی کثرت نے اسے مرغزار اور گلزار بنا دیا تھا۔ سردیوں میں وہاں کبھی کبھی برف باری بھی ہوتی ہے۔ مگر کابل کی وادی جیسی شدید نہیں ہوتی۔ گو اوپر پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ موسم بالکل کشمیر کا سا۔ گرمیوں میں بھی سفر کی تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی۔

کوئی نو بجے کے قریب ملک اور شیوخ جمع ہونے شروع ہوئے۔ ان سب کے سربراہ ملا صاحب باڑہ تھے۔ ملا صاحب سفید ریش بزرگ تھے۔ میرے خیال میں اس وقت ان کی عمر ستّر سال سے متجاوز ہوگی۔ مگر صحت نہایت عمدہ بغیر عینک کے قرآن شریف پڑھتے تھے اور ایسے تیز رو کہ جوان بھی مشکل سے ساتھ دے سکیں۔ دبلے پتلے جسم کے دراز قامت اور چہرے سے نور ایمانی اور فہم و فراست عیاں تھے۔ بات چیت میں نہایت سنجیدہ۔ پہلے میں نے اپنا سارا پروگرام ان کی خدمت میں پیش کیا۔ کہنے لگے امیر حبیب اللہ سے ہمیں اُمید فلاح نہیں۔ کیونکہ جس شخص نے انگریزوں

سے روپیہ دے کر آپ کو کابل سے نکال دیا اس سے کیا توقع ہوسکتی ہے کہ وہ یہاں ہماری کرے گا۔ میں کچھ لاجواب سا ہوگیا۔ لیکن میں نے کہا کہ ہماری سکیم کی باگ دوڑ دراصل نصر اللہ خاں (امیر حبیب اللہ کے برادر اصغر) کے ہاتھ میں ہے۔ اور گو نام امیر حبیب اللہ کا لیا جاتا ہے لیکن روحِ رواں نصر اللہ خاں ہی ہیں۔ اس پر وہ خاموش ہوگئے اور کہا اچھا میں تیار رہوں۔ میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور میرا جی چاہتا ہے کہ میرا سر اسلام کے کام آئے اور میں شہادت کی موت مر کر خدا کے حضور میں سرخرو جاؤں۔ ان کے سادہ الفاظ میں کچھ ایسا جوش تھا کہ دل سے نکلتے تھے اور دل ہی میں جا کر پیوست ہوتے تھے۔ پھر جلسہ شروع ہوا تو پہلے ملا صاحب نے پشتو میں میرا تعارف کروایا اور اس میں یہاں تک فرمایا کہ مولوی محمد علی مجھے اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ جو کوئی مجھے خوش کرنا چاہتا ہے وہ مولوی صاحب کے ساتھ تعاون کرے۔ یہ کافر فرنگی کے خلاف جہاد کی تحریک لے کر آئے ہیں۔ یہ سیدھا جنت کا رستہ ہے۔ مر گئے تو شہید اور جیت گئے تو غازی۔ ہندوستان ہمارا ہے اور ہم اسے دوبارہ کفار کی غلامی سے نجات دلا کر مسلمانوں کے زیر نگیں لائیں گے انشاءاللہ تعالیٰ۔

اس کے بعد میری تقریر شروع ہوئی۔ مولوی فضل ربی نے ترجمانی کے فرائض انجام دیئے۔ یہ مہمند قوم سے تھے اور کئی سال دیوبند رہ کر وہاں سے دستارِ فضیلت حاصل کر کے واپس اپنے وطن آ کر ملا صاحب باجڑہ کے ساتھ منسلک ہوگئے تھے۔ میری تقریر کوئی دو گھنٹہ تک جاری رہی اور چونکہ اسے میں نے بار بار اپنے قیام کے دوران میں دوہرایا اس لئے اس کا خلاصہ حافظہ میں محفوظ ہے۔ میں نے ان مسلمانوں کو دنیا کی سیاست میں ان کا صحیح مقام بتایا اور کہا کہ دنیا اپنے رہبر کی گمشدگی سے پریشان ہے۔ دنیا کے تمام دکھوں کا واحد علاج یہ ہے کہ اسے پھر اسلام کے پیغام سے روشناس کیا جائے اور اس کے لئے اول قدم یہ ہے کہ ہم

انگریزوں سے ہندوستان واپس چھینیں کیونکہ انھوں نے دھوکہ اور فریب سے ہم مسلمانوں کو بے دخل کیا تھا۔ ہندوستان میں دوبارہ اسلامی حکومت قائم کر کے وہاں تبلیغ واشاعت کا ایک منظم سلسلہ قائم کیا جائے۔ پہلے تو وہاں کے آٹھ کروڑ اچھوتوں کو حلقہ بگوش اسلام بنائیں، پھر وہاں کی ساری آبادی ہندو، سکھ، عیسائی کو اسلام کی صحیح تعلیم سکھائیں اور دُنیا کو مسلمان بنانے کی مہم شروع کریں۔ مغرب کی مادہ پرستی نے انسانوں کو خونخوار بھیڑیوں سے بھی زیادہ خونخوار بنا دیا ہے اور وہ اپنے اغراض مشومہ کو پورا کرنے کے لئے قوموں کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا کو مادیت کے چنگل سے چھڑا کر اسلامی اخلاق اور اسلامی صداقت سے روشناس کیا جائے۔

تقریر کچھ اس قدر جوشیلی تھی اور میرے دل میں مغرب کی مادہ پرستی اور اسلام دشمنی کے خلاف اس قدر سخت جذبات مشتعل تھے کہ میں جو کچھ بھی ان کے خلاف کہتا کم تھا۔ تقریر کے خاتمے پر مجھے اب تک یاد ہے کہ سارا مجمع جوش میں کھڑا ہوگیا۔ لوگ جوش سے کہنے لگے کہ لاؤ ہاتھ دو ہم تمہارے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کرتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ ہے ہم انگریزوں کے خلاف تلوار کو نیام میں نہیں کریں گے۔ اس پر میں نے ان کا دلی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ تم لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ملا صاحب باڑہ جیسی ہستی تم میں موجود ہیں۔ پھر میں نے تجویز کیا کہ ملا صاحب باڑہ، حاجی صاحب ترنگزئی اور دوسرے ملا صاحب کو دعوت دیں تاکہ یہاں مشورے سے حملہ کی سکیم طے کی جا سکے۔ چنانچہ ملا صاحب نے سب سے پہلے حاجی صاحب کو دعوت دی۔ چونکہ میں انھیں تیار کر گیا تھا۔ اس لئے انھوں نے فوراً دعوت قبول کر لی۔ ان کے آنے پر ملا صاحب، حاجی صاحب، ملا بشیر صاحب اور میں دیر تک مشاورت کرتے رہے۔ تجویز ہوئی کہ ملا بشیر صاحب ہم سب کی طرف سے یاغستان کا دورہ

کریں اور امیر عبدالجبار والیٔ صوات، امیر نعمت اللہ امیر مجاہدین، سنڈا کے ملا صاحب، مہتر چترال اور نواب امب وغیرہ سے مل کر ان سب کا تعاون حاصل کریں۔ اور یہ فیصلہ کریں کہ ان میں سے ہر ایک انگریز کے خلاف کس کس محاذ پر لشکر کشی کرے گا۔ اس کے بعد ملا صاحب باڑہ اور حاجی صاحب ترنگزائی چمرکنڈ میں جمع ہو کر ان تمام معاہدوں کا جائزہ لیں اور ایک ہمہ گیر منصوبہ مرتب کر کے امیر حبیب اللہ کو دعوتِ جہاد دیں۔

حدیث دردِ دلا ویز داستانے ہست
کہ ذوقِ بیش دہد چوں دراز تر گردد

اب ہماری تحریک انقلاب اپنے پورے شباب پر تھی۔ یاغستان میں سوائے ہماری تیاریوں اور تقریروں کے اور کوئی چرچا ہی نہ تھا۔ مسجدوں میں ہماری کامیابی کے لئے دعائیں کی جاتی تھیں۔ اس لئے جب ملا بشیر صاحب نے قرارداد کے مطابق دورہ شروع کیا تو انگریزوں نے بھی اس کے خلاف باقاعدہ مہم جاری کر دی۔ سب سے پہلے تو انھوں نے مختلف سرحدی مقامات پر جہاں حملوں کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ خاردار تار لگا کر ان میں بجلی کی رو دوڑا دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کوئی شخص اس تار کے قریب بھی جاتا تو وہ صدمہ سے مر جاتا۔ چنانچہ شروع شروع میں کئی موتیں واقع ہو گئیں اور لوگوں میں ایک عام دہشت پھیل گئی۔ دوسری طرف انھوں نے امیر عبدالجبار والیٔ صوات، نواب امب، مہتر صاحب چترال وغیرہم کے پاس اپنے خاص قاصد روانہ کئے کہ خبردار تم ملا بشیر یا اس کی پارٹی کے کسی رکن سے کسی قسم کا تعلق قائم مت کرنا ورنہ تمھارے خلاف نہایت سخت کاروائی کی جائے گی۔ میرے خلاف امیر حبیب اللہ خاں کو سخت انتباہ کیا کہ ہمارے باغیوں سے تم کسی قسم کا تعلق قائم مت رکھو ورنہ کابل کی سالانہ گرانٹ چوبیس لاکھ کی ضبط کر لی جائے گی۔ امیر

صاحب کو ہماری مدد سے بھی روکا گیا۔ ادھر ہمارے خلاف وارنٹ جاری کیے گئے کہ ہماری پارٹی کا جو شخص بھی گرفتار ہو اس پر بغاوت کا مقدمہ چلا کر پھانسی کی سزا دی جائے لیکن خدا کی مہربانی سے ہماری تحریک خوب پھیل چکی تھی اور اس نے یہاں تک اثر و نفوذ پیدا کر لیا تھا کہ بڑے بڑے خوانین اور ملا اس کی علانیہ مخالفت کرنے سے ڈرنے لگے تھے۔

چنانچہ سب سے پہلے تو میں نے خود (Insulated Scissors) (= حاجز قینچی) بنائی اور اس سے بجلی کے تاروں کو جگہ جگہ سے کاٹ کر حملوں کے لئے راستہ نکالا۔ اس ایک واقعے نے ہمارا وقار دوچند کر دیا اور لوگ میری طرف فوق الفطرت قوتوں کو منسوب کرنے لگے۔ ادھر ملا بشیر صاحب کا دورہ شروع ہوا۔ اس میں خلاف توقع کامیابی ہوئی اور جس جگہ وہ پہنچے ان کا نہایت شاندار استقبال ہوا اور "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کا نظارہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ نواب امب، امیر عبدالجبار اور مہتر چترال وغیرہم حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے تھے اور اس وقت وہ بھی ہمارے ہمنوا تھے کہ انگریز کا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ کوئی دن میں گل ہوا چاہتا ہے۔ اس لئے انگریز کی دھمکیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے خفیہ طور پر ملا بشیر صاحب سے ملاقاتیں کیں اور یقین دلایا کہ جونہی امیر حبیب اللہ ہندوستان پر حملہ کریں گے ہم فوراً اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ ہلہ بول دیں گے۔ گو ان لوگوں کی جمعیت چند سپاہیوں سے زیادہ نہ تھی مگر ان کے علاقوں میں اکثر لوگ بندوق چلانا اور گوریلا لڑائی لڑنا خوب جانتے تھے۔ ہتھیار مہیا کرنے کا ہم نے ذمہ لیا بلکہ اکثر قبائلی سردار ہمارے یہاں آ گئے اور ایک عام حملے کی تیاری میں شریک ہو گئے۔

ملا بشیر صاحب بھی ایک بے نظیر انسان تھے مجسم عمل۔ خلوص کا پتلا اور انگریز کے خلاف پروپاگنڈا کرنے میں بڑے مشاق۔ مفرر ایسے اعلیٰ درجہ کے بڑے بڑے مجمعے

ان کی آتش بیانی سے مسحور ہوجاتے تھے۔ جب وہ واپس لوٹے تو ملا صاحب باڑہ اور حاجی صاحب چمرکنڈ تشریف لائے۔ میں نے ان کے قیام وطعام کا پر تکلف انتظام کیا۔ نشست کے لئے چاروں طرف پلنگ اور ان پر نہایت پرتکلف بستر بچھائے گئے اور درمیان میں فرش عام آدمیوں کے لئے۔ قاعدہ یہ تھا کہ مہمان تو پلنگوں پر بیٹھتے تھے۔ اور میزبان فرش پر۔ لیکن جناب ملا صاحب آتے ہی فرش پر بیٹھ گئے۔ ملا بشیر صاحب نے اپنے دورہ کی مکمل روئداد پیش کی۔ ان کی اطلاعات بہت امید افزا تھیں۔ اس پر فیصلہ ہوا کہ میں بھی ایک مختصر سا دورہ کروں اور بطور امتحان کے ایک حملہ انگریزوں کے علاقہ پر کر کے دیکھا جائے کہ لوگ کس حد تک تعاون کر سکتے ہیں تاکہ امیر حبیب اللہ خاں کو ہم کسی قسم کا غلط وعدہ نہ دیں۔

اس دورے میں جن مقامات پر جانا ہوا وہاں کے لوگ اس قدر قوی ہیکل اور خوبصورت جوان تھے کہ ان کی صحت پر رشک آتا تھا۔ ان لوگوں کے خلوص ان کی شجاعت، ان کا ایثار، اسلام سے ان کی شیفتگی نہایت قابل رشک تھی۔ میں اب بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسا زبردست انقلابی لشکر کسی لیڈر کو میسر نہ آسکتا تھا۔ اور اگر امیر حبیب اللہ (جیسا کہ میں آئندہ چل کر بیان کروں گا) انگریز سے مرعوب ہو کر بزدلی نہ دکھاتے تو نہ صرف ہندوستان کی بلکہ شاید عالم اسلام کی تاریخ ہی اور طرح سے لکھی جاتی۔ حالات ایسے مساعد تھے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام کچھ دشوار نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ انگریز کی اس وقت تباہی اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام ایسے امور تھے جو تاریخ کا دھارا بدل دیتے۔

یہاں استطراداً۔ اس علاقے کی ارزانی کا ذکر بھی سن لیجئے: بہترین گھی روپیہ کا چار سیر بکتا۔ شہد خالص بھی روپیہ کا چار سیر۔ عمدہ مرغی روپے کی آٹھ۔ بٹیریں روپے کی سولہ۔ تیتر، چکور روپے کی آٹھ دس۔ انڈوں کی ارزانی تو بیان سے باہر تھی۔

نہایت عمدہ اصل بھینس کا دودھ ایک آنہ سیر۔ جو کبھی ایک من کبھی سوا من فی روپیہ۔ چاول موٹی قسم کے بیس پچیس سیر فی روپیہ۔ گیہوں دو روپے فی من اور کبھی ڈیڑھ روپے فی من۔ لیکن زراعت کے طریقے قدیم چاہی آب پاشی قریباً مفقود تھی۔ بس قدرتی چشمے خود بخود نہروں کی صورت میں مختلف کھیتوں سے گزرتے تھے۔ اس علاقہ میں ایک خطہ ہے جہاں مہمونہ قبیلہ بستا ہے۔ ایسا زرخیز خوبصورت دلکش خطہ بہت کم پایا جاتا ہے اگر اسے سیرگاہ بنایا جائے تو کشمیر اور راولا کمنڈ کی بہترین سیرگاہوں کی برابری کرسکتا ہے۔ لوگ نہایت سادہ مہمان نواز، غیور، بہادر، اور سمجھدار ہیں۔ مہمان نوازی کا تو یہ عالم ہے کہ آپ کسی گاؤں میں چلے جائیے تو آپ وہاں کے مہمان ہوں گے اور جتنے دن بھی آپ وہاں قیام کریں آپ اپنا کھانا نہیں کھا سکتے۔ جب میں وہاں پہنچا تو ہرچند کہ میرے ساتھ اچھا خاصہ لشکر تھا مگر اس قدر تپاک سے ان لوگوں نے میرا خیر مقدم کیا اور ایسی پرتکلف مہمانی کی کہ میں آج تک اسے نہیں بھول سکتا۔

قصہ مختصر میرا دورہ توقع سے بڑھ کر کامیاب ہوا۔ اور لوگوں کا شوقِ جہاد، ان کا ایثار اور ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے ان کا عزم بالجزم قابل داد تھے۔ اور میں جب واپس لوٹا تو اس یقین سے معمور تھا کہ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا مشن ضرور کامیاب ہوگا۔ اور ہم انگریز کو نکال کر ہندوستان میں اسلامی حکومت پھر سے قائم کریں گے انگریزوں نے ہرچند خفیہ ایجنٹ میرے قتل کرنے اور اس تحریک کو ناکام بنانے کے لئے بھیجے مگر انھیں ناکامی ہوئی۔

چمرکنڈ واپس لوٹ کر ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملا بشیر صاحب تو امیر حبیب اللہ خاں کی خدمت میں جائیں اور تمام احوال عرض کرکے ان کا تعاون اور سرپرستی حاصل کریں۔ ادھر اٹک، پاراچنار، کوہاٹ درہ، ٹل، پشاور تمام علاقہ پر بیک وقت لشکر کشی ہو۔ ادھر امیر حبیب اللہ خاں قندھار پر اور

ڈکہ کے راستے کوہاٹ، تھل اور لنڈی کوتل پر حملہ کردیں۔ ان کے حملے کے بعد نواب امب، مہتر چترال اور بادشاہ صاحب صوات وغیرہ اعلانِ جہاد کردیں۔ امیر حبیب اللہ کے ذمہ تمام قبائلی لشکر کو اسلحہ اور روپیہ سے مدد کرنا بھی تھا اور اس کا حتمی وعدہ وہ ملا بشیر کی وساطت سے کرچکے تھے۔ ملا بشیر کو کابل روانہ کرنے کے بعد ہم نے بطورِ مشق کے انگریز پر ایک حملہ کیا۔ اس میں میں اور حاجی صاحب ترنگزئی گنداب، شبقدر اور مچنی کے محاذ پر حملہ آور ہوئے۔ ملا صاحب باڑہ اپنے محاذ پر۔ ہمارے ساتھ کوئی تیس ہزار کا لشکر ہوگا۔ اسے مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر ہم نے تمام درے پر قبضہ کرلیا اور انگریز کی پیش قدمی کی تمام راہیں روک دیں۔ ایک اگلے مورچہ پر میں خود مع ایک سو تیس مجاہدین کے تھا۔ ہم سے کوئی دو سو گز پر انگریزی گورہ فوج خندقیں کھود کر مورچوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے عقب میں شبقدر کا مشہور قلعہ تھا۔ گیارہ ہوائی جہاز ہمارے مورچوں پر پرواز کرکے لشکریوں کی نشان دہی کررہے تھے تاکہ قلعہ کی آتش بار توپیں ہمارے مورچوں پر گولہ اندازی کریں۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز خود بمباری نہ کرسکتے تھے۔ صرف نشان دہی کا کام کرتے تھے۔ قلعہ سے ۲۷ توپیں بہ یک وقت صرف ہمارے مورچہ پر گولے پھینکتی تھیں۔ ہمارا مورچہ ایک مضبوط پہاڑی پر نہایت محفوظ مقام پر تھا اور انگریزی توپوں کے گولے اس کے اندر نہیں آسکتے تھے۔ لیکن عقب میں بیک وقت آکر گرتے اور اس زور سے پھٹتے تھے کہ دل دہل جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ مشین گنوں کی بارش۔ گولوں کے بیک وقت پھٹنے سے پہاڑی کے پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں اڑتے تھے اور "تکون الجبال کالعھن المنفوش" کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ ہمارے مورچہ میں گیارہ آدمی شہید ہوگئے۔ تین دن اور تین رات مسلسل گولہ باری ہوتی رہی اور ہم بھی برابر جواب دیتے رہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ان بہتر گھنٹوں میں نہ ہم نے کھانا کھایا اور نہ پانی کے سوا اور کوئی چیز

ہمارے حلق سے نیچے اتری لیکن جوشِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ نہ تو ہم میں سے کسی کو نیند نے ستایا نہ تھکان محسوس ہوئی۔ آخر تین شبانہ روز کی لڑائی کے بعد انگریزی فوجیں شبقدر کے قلعے میں پسپا ہوئیں اور ہمارے تمام لشکری خندقوں پر پل پڑے تاکہ مالِ غنیمت لوٹیں۔ چناں چہ سینکڑوں بندوقیں اور لاکھوں کارتوس ہمارے قبضے میں آئے۔

جونہی لڑائی ختم ہوئی میں نے دیکھا کہ دیہاتوں سے عورتیں بجاتی ہوئی گیت گاتی ہوئی ہمارے مورچوں میں گھس آئیں۔ مجھے وہ نظارہ اب تک نہیں بھولتا اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ جس قوم کی عورتیں ایسی بہادر اور شیر دل ہوں وہ جو کچھ بھی کرے کم ہے۔ عورتوں نے آکر لاشوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا کہ کوئی شخص پیٹھ پر گولی کھا کر تو نہیں مرا؟ کیونکہ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ بھاگتے وقت مارا گیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ خدا کی مہربانی سے سبھی مقتول سینوں میں گولیاں کھا کر شہید ہوئے ہیں تو ماں اپنے شہید بیٹے کا منہ چومنے لگی، بہن اپنے شہید بھائی کو پیار کرتے لگی، بیوی اپنے شہید شوہر کو گلے لگانے لگی اور پشتو کے گیت گانے لگیں جن کا مطلب یہ تھا کہ "جاؤ تم کو خدا کے سپرد کیا۔ تم شہید ہو۔ اب جنت کی سیریں کرو۔ مگر خدا کے لئے ہمیں نہ بھول جانا۔ خدا سے دعا مانگو کہ ہم بھی اس کی راہ میں کام آئیں اور تمہارے بھائیوں کو بھی توفیق ہو کہ وہ تمہارے نقشِ قدم پر چلیں۔" پھر شہدا کی لاشوں کو اٹھا کر خوشی سے اچھلتی اور گاتی ہوئی گاؤں کو واپس لوٹیں اور ان کو انہی کے کپڑوں میں بغیر غسل دیئے دفن کر دیا گیا۔

وہاں سے واپسی کا وقت اب تک مجھے یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ میں اور اور تمام لشکری نیند اور بھوک سے بے تاب تھے۔ میرا یہ حال تھا کہ چلتے چلتے اونگھ رہا تھا۔ کوئی تین میل پیدل چلنے کے بعد گاؤں آ گیا۔ عورتیں اور بچے اور بڑے

اور بوڑھے ہمارے استقبال کے لئے نکل آئے۔ اور ہر طرف سے مبارک سلامت کے ڈونگڑے برسنے لگے۔ فوراً کھانا چنا گیا۔ کھانے میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مکا کی روٹی اور لسی تھی۔ مکا کی روٹی گھی میں گندھی ہوئی تھی۔ میں نے تمام عمر میں اس سے لذیذ تر کھانا نہیں کھایا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بھوک کی شدت نے مزے کو دوبالا کر دیا تھا۔ اس جہاد نے میری عزت المضاعف کر دی۔ بلکہ غلو نے یہاں تک رنگ آمیزی کی کہ لوگ کہنے لگے کہ گولی مجھ پر اثر نہیں کرتی اور مجھے ایسے جنتر منتر آتے ہیں کہ انگریزی توپوں کا منہ بند کر سکتا ہوں، جس قدر میں تردید کرتا تھا لوگوں کو اسی قدر رسخنہ یقین ہوتا جاتا تھا کہ میں از راہِ کسرِ نفسی ایسا کر رہا ہوں۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ میں جس گاؤں میں سے گزرتا تھا وہاں کے مریض سب کے سب دم کروانے کے لئے میرے گرد جمع ہو جاتے۔ چنانچہ ان کی دل داری کے لئے مجھے ان سب پر قرآنی آیتیں پڑھ کر پھونکنا پڑتیں۔

جب ہم چمر کنڈ پہنچے تو سول اور پانیر منگوا کر اپنی پہلی یورش کی سرکاری کیفیت پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں کیمبرج میں تھا تو لارڈ ارے نے ایک لیکچر دیا تھا جس کا عنوان تھا "تاریخ میں راست گفتاری کی نوعیت" اس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ "موجودہ تہذیب و تمدن کا سب سے بڑا شکار راست بازی اور صداقت ہے۔" یعنی ہماری تاریخ، ہماری تہذیب سب اکاذیب و اباطیل سے آراستہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ سول اور پانیر کی افیشل اطلاعات کو پڑھ کر مجھے ہنسی بھی آئی اور یقین بھی ہو گیا کہ انگریزی مورخین یا نامہ نگاروں سے حق کی توقع رکھنا بالکل عبث ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ کذب اور دروغ بیانی ممکن نہ تھی۔ شاید موجودہ جنگوں میں متحاربین اسی طرح رپورٹیں اپنے اپنے اخبارات کو دیتے ہوں گے۔

ہم نے صحیح واقعات کی مفصل روئداد ملا بشیر صاحب کو دے کر کابل روانہ کیا۔

نائب السلطنت جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں انگریز کے نہایت سخت دشمن تھے۔ اس لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ انگریزوں کی ہزیمت کی خبر سے خوش نہ ہوتے۔ انھوں نے اس وقت سے ہندوستان کی فتح کے خواب دیکھنا شروع کئے لیکن امیر حبیب اللہ خاں پر اس کا اثر الٹا پڑا۔ انھوں نے نائب السلطنت سے کہا کہ میں ملا بشیر سے علانیہ نہیں مل سکتا۔ نائب السلطنت کے اصرار پر کہا کہ اچھا رات کو ہمارے خواب گاہ میں ملا بشیر کو حاضر کرو۔ کوئی رات کے شاید بارہ بجے نائب السلطنت صاحب ملا بشیر کو لے کر قصر دلکشا کے نہایت آراستہ کمرے میں حاضر ہوئے۔ امیر صاحب نے رسمی طور پر مزاج پرسی کی اور حالات سنے۔ لیکن ان کا وہ جوش و خروش بالکل غائب ہو چکا تھا۔ ملا بشیر بے چارے پر بھی اوس سی پڑ گئی۔ خیر واپس آ کر وہ نائب السلطنت کے ہاں مقیم ہوئے۔ نصر اللہ خاں بھی ملا بشیر کی مایوسی کو بھانپ گئے اور مختلف تاویلوں سے امیر صاحب کی بے رخی کے اثر کو مٹانے کی کوشش کی۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ اعلیٰ حضرت کو ہر فریق کو خوش کرنا پڑتا ہے۔ انگریزوں کو چونکہ یورپ میں شکستیں ہو رہی اور مستقبل تیرہ و تار نظر آ رہا ہے اس لئے امیر صاحب نہیں چاہتے کہ انھیں خفگی کا موقع دیں کہ کہیں کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق وہ کابل ہی چڑھائی نہ کر دیں۔ پھر انھوں نے بتایا کہ انگریزوں نے امیر صاحب کو ایک بہت سخت مراسلہ بھیجا ہے کہ خبردار تم باغیوں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی مٹھی گرم کرنے کا وعدہ بھی تھا۔ نائب السلطنت صاحب نے رخصت کے وقت ملا بشیر کو شاید بارہ یا پندرہ ہزار روپیہ نقد اور کچھ اسلحہ دیے کہ انھیں قبائلی سرداروں میں تقسیم کر دیں۔

یہ مستبد بادشاہ بھی عجیب قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ بلکہ شاید انھیں انسان

کہنا انسانیت کی توہین ہو۔ نہایت سخت خود غرض، بے رحم، عیار و مکار، ہر شخص سے خائف اور اپنے خیر خواہ ترین اعزا و اقربا سے بھی بدظن۔ ان کے پیش نظر صرف اپنے اقتدار اور اپنے تعیش کے سامان کو محفوظ رکھنے کے سوا کوئی اور مقصد نہیں ہوتا۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ "کسی انقلابی تحریک کی رہ نمائی کریں گے حماقت اور خود فریبی ہے۔ مگر افسوس کہ ہم اس وقت تک اسی خود فریبی میں مبتلا تھے کہ امیر حبیب اللہ درحقیقت ہمارے ساتھ ہیں اور انگریزوں کو محض چکمہ دے رہے ہیں۔ حالانکہ وہ فریقین کو چکمہ دے رہے تھے لیکن ہماری آخری ٹکر نے انھیں چوکنا کردیا۔ بعد میں جب پتہ چلا کہ ملا بشیر کے کابل سے رخصت ہونے کے بعد امیر صاحب نے اپنے اعیان و اعزا کی ایک نہایت راز کی کونسل منعقد کی جس میں نصر اللہ خاں، امان اللہ خاں، نادر شاہ اور ان کے بھائی، علیا حضرت (امیر صاحب کی محبوب ترین ملکہ اور امان اللہ خاں کی والدہ) شریک تھے۔ اس میں انھوں نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ یہ تحریک اب صحیح معنوں میں انقلابی ہوتی جارہی ہے اور ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ افغانستان کو بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لے اور یہاں بھی ایک جمہوری حکومت کے قیام کی شورش نہ شروع ہو جائے جس کا انجام یہ ہو کہ مبادا خاندان ختم ہو جائے اور کوئی اور فریق برسر اقتدار آجائے۔ اس جلسے میں صرف نصر اللہ خاں اور علیا حضرت نے ہماری تائید کی اور کہا کہ اگر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کیلئے ہمیں اپنا تاج و تخت بھی قربان کرنا پڑے تو اس کی پرواہ نہیں۔ ع:-

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

علیا حضرت نے کچھ اس قدر سخت لہجہ میں کلام کیا کہ اعلیٰ حضرت ناراض ہو گئے اور انھیں باغ بالا میں خانہ نشین یا نظر بند کردیا۔

ملا بشیر واپس ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ امیر حبیب اللہ کی طرف سے اب

سرد مہری کا برتاؤ شروع ہو گیا۔ مثلاً جرمن کمیشن کے ممبروں کو کابل سے رخصت کر دیا گیا۔ ہمارے لیے ہتیاروں کی فراہمی سخت مشکل ہو گئی۔ پہلے ہمارے ایجنٹ چمر کنڈ سے کابل اور کابل سے افغان راہداری (پاسپورٹ) لے کر بے خوف و خطر ہندوستان آتے جاتے تھے، جہاد کے لیے روپیہ فراہم کرتے تھے اور اس راستے سے واپس ہمارے پاس پہنچ جاتے تھے۔ مگر اب امیر صاحب نے اس کام میں بھی رکاوٹیں ڈالنی شروع کیں۔ ادھر یاغستان میں ہمارا کام زوروں پر تھا اور لوگوں کا جوش المضاعف ہو رہا تھا اور لوگ کہتے تھے کہ امیر افغانستان کیوں ہندوستان پر حملہ نہیں کرتا۔

یہ مسئلہ کہ انقلابی تحریکیں لیڈر پیدا کرتی ہیں یا لیڈر اپنی ہوشیاری، تدبر اور قربانی و ایثار سے انقلابی تحریکوں کو چلاتے یا کامیاب بناتے ہیں، مرغی اور انڈے کی پیدائش کے مسئلے کی طرح لاینحل ہے۔ مگر ہم نے تو آزما کر دیکھا کہ اکثر تحریکیں لیڈروں کی ناعاقبت اندیشی یا بزدلی سے ناکام ہو گئیں۔ ہندوستان میں ہم نے مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کی تحریک اٹھائی مگر اس میں بھی غلطی یہ کی کہ مولانا ابوالکلام کو امام الہند بنا کر تمام تحریک ان کے بل بوتے پر کھڑی کی لیکن عین وقت پر مولانا آزاد کی بزدلی نے تمام کھیل بگاڑ دیا اور وہ سارے کا سارا محل جس کی تعمیر پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا تھا اور سینکڑوں مسلمانوں نے اسے اپنے خون سے سینچا مولانا کی گریز پائی کی وجہ سے آن کی آن میں دھڑام سے نیچے آن گرا۔ اسی طرح سلطان ابنِ سعود کی تحریک الاخوان جس کے متعلق اچھے اچھے مبصروں کا خیال تھا کہ عرب کی کایا پلٹ دے گی، وہاں لیڈروں کی نالائقی اور کوتاہ اندیشی کا شکار ہو گئی۔ یہی حال ہماری تحریک کا ہوا۔ ہماری تحریک ایک نہایت زبردست انقلابی تحریک تھی مگر اس کا محور امیر حبیب اللہ کی ذات تھی اور اپنے حسن ظن یا ناتجربہ کاری کی بنا پر یہ نہ سوچا کہ میر حبیب اللہ اپنی فطرت کو کیونکر ترک کر سکتا

ہے اور ایک شخص جس کا ضمیر ہی غیر اسلامی ہو کیونکر اسلام کا موید و حامی بن سکتا ہے
قصہ مختصر ہم تو امیر حبیب اللہ کا پروپیگنڈا کر رہے تھے اور وہ ہم سے زیادہ سے زیادہ بدظن ہوا جا رہا تھا۔ شاید اس کو یقین ہو گیا تھا کہ ہم کامیاب ہونے کی صورت میں خود اس کا سر کچل دیں گے اور ایک صحیح جمہوری یعنی اسلامی حکومت قائم کریں گے اور اس کی استبدادیت کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس لئے وہ طرح طرح سے اب ہمیں ناکام بنانے کے درپے ہو رہا تھا۔ اس کی طرف سے اب ہمارے کام کی راہ میں مختلف رکاوٹیں پیدا کی جانے لگیں۔ مگر ہم اصلی حالات سے اس وقت تک بے خبر تھے اور کچھ اپنے جوشِ جنوں میں ان سب حرکتوں کی توجیہ کر کے اپنے دل کو تسلی دے لیتے تھے کہ یہ باتیں انگریز کے ڈر کی وجہ سے ہیں! اور جب حملہ کا وقت آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا، پھر بھی ہم امیر حبیب اللہ خاں کے رویہ سے بددل ضرور ہو گئے تھے اور ہم نے اب ارادہ کیا کہ ہم کوئی اور راستہ اختیار کریں۔ ایک تو یہ تھا کہ خود افغانستان میں انقلاب کر دیا جائے اور امیر حبیب اللہ خاں کی جگہ سردار نصر اللہ خاں کو افغانستان کا بادشاہ بنا دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان سے کوئی صاحب اثر لیڈر بلا کر یاغستان میں اُسے امام بنا دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ امیر المجاہدین امیر نعمت اللہ کو اس تحریک کا لیڈر بنا دیا جائے۔ لیکن حالات کی نزاکت ہمیں فوری اور عاجلانہ اقدام سے روکتی تھی۔ اب صورت حالات یہ تھی کہ ہم نے خود تحریر سے تقریر سے پمفلٹ، جلسوں اور اشتہاروں کے ذریعہ امیر حبیب اللہ کو مسلمانوں کے نجات دہندہ کے طور پر قبائلیوں کے سامنے پیش کیا تھا اور اب یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ ہم خود ہی اس کو خائن و غدار کہنا شروع کر دیں۔
قبائلی بالکل اَن پڑھ لوگ تھے اور اَن پڑھ آدمی کا یہ قاعدہ ہے کہ اُسے جب بھی کسی بات پر ایمان ہو جاتا ہے وہ حد سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ وہ پھر نفسیاتی طور پر

اس شخص کے خلاف کوئی بات سننی گوارا نہیں کرسکتا۔ پیری کی کامیابی کا یہی راز ہے۔
غرض ہم اگر فوری طور پر امیر صاحب کے خلاف کوئی لفظ نکالتے تو ان لوگوں کی نظروں میں خود مجرم قرار پاتے۔ اس لئے پہلے ہم نے اپنے خاص آدمیوں کی مجلسِ شوریٰ منعقد کی۔ اس میں کئی نہایت سرگرم کارکن شریک تھے۔ بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ چمرکنڈ کے اسکول اور ٹریننگ سنٹر کو فی الحال بند کرکے میں دوبارہ یاغستان کا دورہ کروں اور ملوک و خوانین سے براہ راست مل کر تحریک کو دوسرے راستے پر ڈالنے کی کوشش کی جائے۔

مستقل کام کے لئے بہت زبردست منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ چناں چہ ایک مفصل اسکیم تیار کی گئی جس میں دو باتیں نہایت اہم تھیں۔ ایک تو یہ کہ قبائلیوں کو تعلیم سے روشناس کرکے انھیں ضبط و نظم کے تحت لایا جائے تاکہ وہ بذاتِ خود ایک لشکر بن سکیں اور ان کے جوہر جو صرف لوٹ مار میں ضائع ہو رہے تھے کسی کام آسکیں۔ دوسرے ان کی اقتصادی اصلاح اور ان کی فاقہ مستی کا علاج۔ چنانچہ میں نے بعض جگہ زراعت کے اصلاح شدہ طریقوں کو رواج دینے کی کوشش کی مگر افسوس کہ جیسا کہ میں بعد میں لکھوں گا۔ حالات نے مساعدت نہ کی۔ اس کے لئے روپیہ کی بڑی ضرورت تھی اور اب افغانستان کی بے رخی سے ہمارا سہارا صرف ہندوستان ہی رہ گیا تھا۔

معمولی حالات میں ہندوستان سے ہمارے پاس کافی روپیہ پہنچ جاتا تھا۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر حالات سرعت سے بدل نہ جاتے تو یقیناً وہ رقم ہماری تمام اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہت کافی ہوتی، مگر ہندوستان کے حالات یک لخت بدل گئے۔ گورنمنٹ انگریزی جو جنگ کی ابتدا میں بالکل تیار نہ تھی، اپنے بے شمار وسائل کو کام میں لاکر فوجی تیاریاں مکمل کر رہی تھی اور بہت سی گورا فوج

سرحدوں کی ناکہ بندی کے لئے آ رہی تھی۔ دوسرے ہندوستان میں گرفتاریوں اور
نظر بندیوں کی وجہ سے بڑے بڑے لیڈر نہایت خفیہ طور پر ہمارے قاصدوں سے
ملاقاتیں کرتے اور زیادہ روپیہ ارسال کرنے سے ڈرتے تھے کہ مبادا انگریزی سی
آئی ڈی کے آہنی پنجہ میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی جن
کے متعلق میں پہلے بھی لکھ آیا ہوں کہ یاغستان کے تقریباً تمام مولوی ان کے شاگرد
اور مرید تھے، ہمارے پاس آنے کے لئے تیار تھے اور ان کے شاگرد رشید مولوی
محمد میاں اور مولانا کے خاص الخاص آدمی ہمارے پاس پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے
وعدہ کیا کہ مولانا محمود الحسن صاحب کو دیوبند سے چمرکنڈ لے آئیں گے اور انھیں
امیر المجاہدین بنا کر تحریک جہاد کو تیز تر کرائیں گے۔ مگر گورنمنٹ انگریزی نے بھی
فوراً مولانا مرحوم پر سخت چوکی پہرہ مقرر کر دیا۔ ادھر میرے والد ماجد مولانا عبد القادر
قصوری پر بھی سخت نگرانی شروع کر دی۔ اب مولانا صاحب تو اس قدر مجبور ہوئے
کہ انھوں نے فوراً یہ ارادہ کیا کہ حج بیت اللہ کے ارادے سے حجاز چلے جائیں اور
وہاں سے ایران اور افغانستان ہوتے ہوئے ہمارے پاس چمرکنڈ تشریف لے
آئیں۔ سرکار انگریزی کی اتنی جرأت تو نہ ہوئی کہ انھیں اس ارادے سے روک دیتی
مگر ایک جاسوس مولوی کو ان کی معیت میں اپنے خرچ پر بھیج دیا۔ اس مولوی (میں
بالارادہ ان کا نام نہیں لیتا کیونکہ بہت سے لوگ انھیں جانتے ہیں) کا کام دوگونہ
تھا۔ ایک تو نہایت ہوشیاری سے مولانا کے ارادوں کی اطلاعات سرکار
انگریزی کو پہنچانا، دوسرے ان کے منصوبوں کو ناکام بنانا۔ چنانچہ ان مولوی
صاحب کو خلاف توقع پوری کامیابی ہوئی اور بدبخت شریف حسن نے حضرت مولانا
کو نظر بند کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا اور انگریزوں نے حضرت کو مالٹا میں
نظر بند کر دیا۔ ادھر امیر کابل کی بے رخی نے امیر عبد الجبار، مہتر صاحب چترال اور

نواب امب کو بھی بھڑکا دیا اور انھوں نے صاف کہا کہ ہم اکیلے کیونکر انگریز کے غصے کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حقیقت میں ان کا وعدہ امیر صاحب کی لشکر کشی کے ساتھ مشروط تھا۔ اس لئے اب ان کا علانیہ انگریز کے خلاف ہماری طرف جھکنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ مگر پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ ان کے دلوں میں ہندستان میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کا خیال ضرور تھا اور اگر اس میں کامیابی کی کوئی صورت دیکھتے تو وہ ضرور شامل ہو جاتے۔

بہر حال یہ تو ہمارے لئے ممکن نہ تھا کہ امیر حبیب اللہ خاں کے خلاف ایک لفظ زبان سے نکالتے، مگر خدا کی شان کہ عامۃ الناس کو امیر صاحب کی اس بے رُخی بلکہ دشمنی کا احساس ہونے لگا اور اکثر ہوشمند خواتین نے ہم سے کہنا شروع کیا۔ کہ امیر صاحب کو تخت سے اتار کر کسی "مسلمان" کو بادشاہ بنانا چاہیئے۔ بلکہ بعض سادہ لوح افغانوں نے مجھ سے یہاں تک آن کر کہا کہ "ملا صاحب! آپ کو معلوم ہے یہ فرنگی اس قدر عیار ہے کہ ہمارے حبیب اللہ خاں کو چرا کر لے گیا ہے اور اسے قتل کر کے ایک فرضی حبیب اللہ کو اس کی جگہ بٹھا یا گیا ہے تاکہ ہمارے کام میں کھنڈت ڈالتا رہے ......" لیکن میری اپنی قلبی کیفیت عجیب تھی۔ جوں جوں امیر حبیب اللہ کی منافقت بے نقاب ہوتی جا رہی تھی میرے دل میں انگریز دشمنی کے جذبات روزانہ اور زیادہ مشتعل ہوتے جاتے تھے۔ اور میری تقریریں اس دور میں نہایت سخت اشتعال انگیز اور انگریزی نفرت سے معمور ہو گئی تھیں میں اپنا تمام غصہ انگریز کے خلاف نکالتا تھا۔

مجھے صحیح طور پر یاد نہیں کہ میں نے کتنے ہفتے دورہ کیا اور کن کن علاقوں کا دورہ کیا، مگر اتنا یاد ہے کہ میرا دورہ بہت لمبا چوڑا تھا اور میں نے مہمند، بھونہ، باجوڑ، صوات، دیر، چترال، امب وغیرہ کے اکثر علاقوں کا دورہ کیا۔ بالائے

سندھ کی اس وادی میں دریا کا پانی اس قدر شفاف، شیریں اور ٹھنڈا ہوتا ہے کہ جون جولائی کی گرمیوں میں اس کے پینے سے دانت بجنے لگتے تھے۔ نہایت ہاضم اور مقوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لبنے والے لوگ نہایت قوی ہیکل خوبصورت اور تنومند ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی کچھ ایسی سادہ اور فطری ہوتی ہے کہ میں نے ان میں بہت کم بیماریاں دیکھیں اور عموماً لوگوں کی عمریں بہت لمبی۔ کئی لوگ ایسے ملے جنھوں نے حضرت سید احمد شہید کی لڑائیاں دیکھی تھیں اور ان کی عمر اس وقت سو سال سے متجاوز تھی۔ ان کی غذا بھی بالکل سادہ اور تکلفات سے خالی۔ اخلاقی لحاظ سے بھی ان کی حالت قابل رشک تھی اور میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوگی تو شاید ایسے ہی با اخلاق اور بہادر لوگوں سے ہوگی۔

اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اس دوران میں انگریزوں نے بھی کوشش کی کہ میرے دورہ کو ناکام بنا دیں۔ اور اگر میں کبھی ان کی سڑک پر سے گزروں تو مجھے گرفتار کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک رات ہم چترال کی سڑک کے کنارے ایک گاؤں میں پہنچے۔ وہاں ایک ندی کے ساتھ ساتھ انگریزی سڑک چترال کو جاتی تھی۔ سڑک کو پار کر کے صوات کی سرحد میں داخل ہونا تھا۔ اور اگر سڑک کا راستہ اختیار نہ کیا جاتا تو ہمیں کئی دن کا چکر کاٹ کر پھر اسی جگہ آنا پڑتا۔ اس لئے ہم نے خیال کیا کہ چلو اس سڑک پر سے گزر چلو۔ انگریزوں کو بھی اس کا علم ہوگیا۔ چنانچہ اس تمام سڑک پر گوروں کا پہرہ لگا دیا گیا اور میرے گھر قصور کی تلاشی لے کر میرے کئی فوٹو ان گوروں کو پہنچا دیئے گئے۔ یاغستانی قبائل سے انگریزوں کا معاہدہ تھا کہ وہ ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کریں گے اور وہ آزادانہ سڑک کے آر پار آتے جاتے تھے۔ مگر میری صورت دوسری تھی۔ میں قانوناً انگریزی رعایا تھا اس لئے انگریز مجھے گرفتار کر سکتے تھے۔

اس گاؤں میں ہمیں بھی اطلاع پہنچ گئی کہ محمد علی کو گرفتار کرنے کے لئے پورا دستہ سڑک پر متعین کر دیا گیا ہے مگر میں اور تین چار ساتھی افغانی ملاؤں کے لباس میں رات کے آخری حصے میں سڑک چھوڑ کر ندی پار کر گئے۔ گوروں کے ساتھ ایک مسلمان سردار تھا جس نے پشتو میں پوچھا کہ "کون جا رہا ہے"۔ میرے ساتھی نے جواب دیا کہ "باغستانی قبائل کے ملاں"۔ اس پر انھوں نے کہا "اچھا جاؤ" اور ہم پار ہو گئے۔ صبح کی نماز کے بعد ہمارے قافلہ نے سڑک پار کی۔ گوروں نے ایک ایک شخص کو دیکھا۔ محمد علی ہوتا تو اُسے گرفتار کرتے۔ انھوں نے سوچا کہ شاید محمد علی فرار ہو گیا اور واپس گیا۔ مگر ان کی لاعلمی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی کیونکہ اُس دن میں نے جمعہ کا خطبہ صوات میں دیا اور نہایت دھڑتے سے انگریز کے خلاف تقریر کی۔

صوات میں ہم امیر عبدالجبار صاحب بادشاہ صوات کے مہمان ہوئے۔ یہ غالباً صوات کے سادات میں سے تھے اور ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے اور مرزا غلام احمد کے مرید ہو گئے جب مرزا غلام احمد کی جماعت حکیم نورالدین کی وفات پر دو جماعتوں میں بٹ گئی تو یہ لاہوری پارٹی میں شریک ہو گئے۔ لاہوری پارٹی مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتی اور ختم نبوت کی بھی اس معنی میں قائل ہے جس معنی میں عامۃ المسلمین مانتے ہیں۔ لیکن یاغستان میں لوگوں کو احمدیت کے نام سے چڑھ تھی اور ان کے لئے لاہوری اور قادیانی دونوں برابر تھے۔ اس لئے عبدالجبار صاحب اپنی مرزائیت چھپاتے تھے اور عامۃ المسلمین کی مساجد میں جاتے اور ان کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، بلکہ لبا اوقات اپنی احمدیت سے انکار بھی کرتے تھے۔ نہایت خوش پوش اور خوش اطوار مہذب انسان تھے۔ ان کے دو بھتیجے تھے جو بلند قامت، تعلیم یافتہ خوش رو نوجوان تھے۔ یہ سب نہایت خلیق اور سنجیدہ اور دردِ دل رکھنے والے

مسلمان تھے، لیکن انگریزوں نے بری طرح ان کا ٹیٹو اد بار رکھا تھا وہ صاحبزادہ عبدالقیوم یا سر جارج روس کیپل کے اشاروں پر ناچتے تھے۔ کیونکہ صاحبزادہ انھیں ہر وقت آنکھیں دکھاتا رہتا تھا کہ تم ہمارے خلاف ہوئے تو ہم نے تمہاری احمد بیت کا بھانڈا پھوڑا۔ ان کے مد مقابل اخوند صاحب صوات مرحوم کے نواسے پادشاہ گل تھے۔ یہ بھی خاندانی سید اور یاغستان کے بہت بڑے سجادہ نشین تھے۔ اخوند صاحب صوات کے بہت بڑے پیر اور ولی تھے۔ حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، لیکن بعد میں جب ان کے خلاف وہابیت کا الزام لگایا گیا تو یہ نہ صرف ان سے علاحدہ ہو گئے بلکہ عام روایت کے مطابق ان کی مخالفت میں سکھوں اور پٹھانوں سے مل گئے۔ بہر حال مجھے ان واقعات کا کوئی علم نہیں، لیکن یہ سید صاحب کے بڑے مخالفین میں سے تھے۔ ان کے اولاد نرینہ شاید کوئی نہ تھی اس لئے نواسے ہی سجادہ نشین قرار پائے۔ نواسے بالکل جاہل قسم کے پٹھان تھے اور گو ہم سے بہت خلق سے پیش آتے تھے اور ہر طرح سے تعظیم و تکریم کرتے تھے مگر ان کے مزاج میں ایک اکھڑ پن تھا جو خاندانی امیرزادوں کا امتیازی وصف ہوتا ہے۔

بہر حال ہم امیر عبدالجبار کے مہمان ہوئے۔ انھیں صاحبزادہ عبدالقیوم سے پہلے ہی تنبیہ کی جا چکی تھی کہ اگر تم نے گورنمنٹ انگریزی کے باغیوں کو اپنے ہاں ٹھہرایا تو تمہاری خیر نہیں۔ مگر انھوں نے کہا کہ قبائلی رسم کے مطابق میں مہمانی کے لئے مجبور ہوں۔ ہم غالباً ایک دن ان کے ہاں ٹھیرے۔ رات کو تخلیہ میں میری اور ملا بشیر صاحب کی ان سے دل کھول کر باتیں ہوئیں اور ہمیں اس امر سے خاص خوشی ہوئی کہ وہ ایک روشن خیال مسلمان تھے اور اسلامی سیاسیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، لیکن انگریز کے دباؤ کی وجہ سے بالکل بے دست و پا تھے۔ انھوں نے ہمیں بتلایا کہ

امیر حبیب اللہ کو امام بنانے میں ہم نے بڑی سخت غلطی کی ہے کیونکہ وہ ایک بے کار، عیاش اور دُنیا پرست بادشاہ ہے۔ جسے اپنے روزمرّہ کے اخراجات کے لئے روپیہ کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے اس لئے وہ مجبور ہے کہ انگریز کے سامنے ہاتھ پھیلائے رکھے۔ ہم نے انھیں بتایا کہ حقیقت میں ہماری تمام تحریک کا محور سردار نصراللہ خاں نائب السلطنت ہیں، لیکن نشان دہی کے لئے امیر حبیب اللہ کو سامنے رکھ چھوڑا ہے کیونکہ سلطنت کے معاملات کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کی شمولیت ضروری تھی۔ آخر صلح و جنگ کے مسائل نائب السلطنت صاحب اپنے بڑے بھائی کی موجودگی میں ان کی اجازت کے بغیر کیوں کر طے کر سکتے ہیں۔ اس لئے لامحالہ اعلیٰحضرت کو اس تحریک میں شامل کرنا ضروری تھا اور جب انھیں شامل کیا تو وہ بحیثیت صدر کے ہی شامل ہو سکتے تھے۔ پھر ہم نے کہا کہ اگر امیر صاحب علانیہ میدان میں نہ بھی اُترے تو بھی ہمارا مقصد تو حاصل ہو جائے گا یعنی ترکوں اور اسلام کے دشمن کو پریشان تو کریں گے۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ خفیہ طور پر میں جس قدر بھی مدد کر سکوں گا کر دوں گا۔ علانیہ تو میں کچھ کر نہیں سکتا۔

ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ ہماری وجہ سے امیر عبدالجبار کو صوات کے تخت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ گو ان کے خلاف مرزائیت وغیرہ کے الزام تھے مگر ان سب کی تہہ میں ہماری تحریک کے ساتھ ہمدردی تھی جس نے انھیں سرکار انگریزی کا معتوب بنا دیا تھا۔ ان کی جگہ بادشاہ گل صاحب کو صوات کا والی بنا دیا گیا۔ ہم امیر عبدالجبار صاحب کے بعد بادشاہ گل صاحب کے ہاں بھی گئے اور صوات کا دورہ کر کے سنڈا کے ملا صاحب کے ہاں بھی حاضر ہوئے اور ان سے ملے۔ یہاں ہمیں ایک عجیب قسم کے حشرات الارض سے پالا پڑا۔ پسّو اور کھٹمل تو آپ نے سُن رکھے ہوں گے ہر شخص جو پہاڑوں پر جاتا ہے یا اُسے ریل میں سفر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے۔

ان سے خوب واقف ہے۔ لیکن یاغستان میں ایک تیسری قسم اُنہی کی پائی جاتی ہے۔ جسے یاغستانی لوگ بڑوڑا کہتے ہیں یہ اتنا ظالم ہے کہ اگر کسی مکان میں گھس جائے تو پھر مکینوں کو نکال کر ہی دم لیتا ہے۔ یہ پسّو کے برابر ہوتا ہے لیکن اس قدر ظالم کہ ایک دفعہ بدن پر پھر جانے سے تمام بدن پر سرخ چھتے پڑ جاتے ہیں اور ان میں اس قدر سخت جلن اور کھجلی ہوتی ہے کہ الامان الحفیظ۔ صوات کے ایک گاؤں میں مجھے بھی بڑوڑا کا تجربہ ہوا۔ ایک رات ایک بڑوڑا میرے کرتے میں گھس گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ تمام بدن پر سُرخ آبلے پڑ گئے۔ اور میں کھجاتے کھجاتے نڈھال ہو گیا۔ تمام رات نہایت مشکل سے آنکھوں میں کاٹی۔ صبح ہوتے ہی گندھک اور مکھن منگوا کر اس کا مرہم بنا کر تمام جسم پر ملا۔ دو تین گھنٹہ دھوپ میں بیٹھنے کے بعد گرم پانی سے غسل کیا تو قدرے سکون ہوا۔ تین دن تک مسلسل یہی علاج کرنے کے بعد آرام ہوا۔ اس کے بعد تو میں کسی مہمان خانہ میں قیام کرنے سے پہلے پوچھ لیتا تھا کہ یہاں بڑوڑا تو نہیں ہے۔

صوات کے لوگ انگریزی اثر میں نسبتاً زیادہ تھے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہر جگہ ہمارا نہایت پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ گو ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہماری ڈائری روزانہ انگریزوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ مگر ہمارا کوئی کام خفیہ نہ تھا۔ ہم یہ یقین کر چکے تھے کہ اب خواہ فتح ہو خواہ شکست ہندوستان اور اپنے اعزہ تو ہم سے ہمیشہ کے لئے چھٹ چکے ہیں۔ اس لئے جس قدر امیر حبیب اللہ کی طرف سے مایوسی ہوتی تھی اسی قدر میرے کام میں تیزی اور ہمارے پروپیگنڈا میں انگریز کے خلاف زیادہ زوردار زہر فشانی ہونے لگی ہے۔

نوا را تلخ تر مے زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر مے خواں چو محمل را گراں بینی

افسوس ایسے بے نظیر قبائلی جن میں ترقی اور حضارت کے فطری جوہر موجود تھے اور جو اسلام کی بے پناہ تلوار ثابت ہو سکتے تھے انگریزی روپیہ کی وجہ سے بے کار، عیش پسند، آرام طلب اور ایمان سے تہی دامن ہوتے جا رہے تھے۔ انگریز نے انھیں خوشامدی اور چاپلوس بنا دیا تھا۔ جس قبیلہ کا ایک دفعہ انگریز سے پالا پڑ گیا وہ ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کے قابل افراد یا تو انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر انگریز کے نمک خوار اور خیر خواہ ہو گئے اور ان کی بہادری اور شجاعت انگریز کا نام بلند کرنے کے لیے وقف ہو گئی یا پھر انگریز کے خوشامدیوں اور جی حضوریوں کی فہرست میں داخل ہو کر ارذل الناس کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ گو مجھے اب ان لوگوں سے زیادہ تعلق نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اب بھی اگر ہماری حکومت پاکستان انگریز کی پالیسی کو ترک کر کے انھیں تمدن اور تعلیم سے آشنا کرنے کی کوشش کرے تو وہ بہت مفید ہو سکتے ہیں اور اسلام کا نام بلند کرنے میں پاکستان کے دست و بازو بن سکتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اس دورے کے دوران میں بھی ہم انگریز کے خلاف عملی اقدام کرتے رہتے تھے کیونکہ ہمارا اصل مقصد اب صرف انگریز کو پریشان کرنا ہی رہ گیا تھا۔ اس کے لئے ہم مختلف علاقوں سے چھاپے، شب خون مارتے رہتے تھے، ان چھاپوں سے انگریزی حکومت کافی سے زیادہ پریشان رہتی تھی۔ چنانچہ ہندوستان کے انگریزی اخباروں میں ان ڈاکوؤں کے حالات عجب رنگ آمیزی سے شائع ہوتے تھے ان ڈاکوؤں کو "دیوانہ ملا" اور اس کے مریدوں کی کارستانیوں سے تعبیر کیا جاتا تھا اور قبائلی مجاہدین کی وحشت اور بربریت کی داستانیں خوب مبالغہ سے شائع کی جاتی تھیں۔ ان سے ایک تو ہمارے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پھیلانا

ور دوسری طرف ہندو مسلمان اتحاد کو نقصان پہنچانا ہوتا تھا۔ ان فرضی قصّوں میں ہندو نوجوان لڑکیوں کے اغوا کی داستانیں، ان کے لونڈی بنا کر فروخت کرنے کے قصّے اور بیاہ شادی کی پارٹیوں کے لٹنے کی کہانیاں وغیرہ خوب شامل کی جاتی تھیں۔ چنانچہ پانیر اور سول کے اس پروپیگنڈا کا اثر یہ ہوا کہ اکثر ہندو لیڈر نہ صرف افغانستان اور یاغستان سے بلکہ مسلمانوں سے بددل ہونے لگے۔ چنانچہ جب میں ہندوستان لوٹا اور گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو گاندھی جی نے غالباً ۱۹۲۰ء میں الٰہ آباد میں پنڈت موتی لال جی کے دولت کدہ پر ہندو مسلمان لیڈروں کا ایک بہت بڑا جلسہ کیا جس کا مقصد ہندوؤں کو مسلمانوں کی تائید وحمایت میں ستیہ گرہ کے لیے تیار کرنا تھا۔ چنانچہ اصل ریزولیوشن جس کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ اب مسلمان بھائی خلافت کی بربادی کی وجہ مذہباً مجبور ہو گئے ہیں کہ انگریز سے عدم تعاون کریں اس لئے ہندوؤں کا بھی ملکی فرض ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کا ساتھ دیں۔ اس ریزولیوشن کو پیش کرنے کا قرعہ میرے نام پڑا۔ چنانچہ میں نے ایک مفصل انگریزی تقریر میں خلافت اسلامیہ کے متعلق انگریزوں کی وعدہ خلافیوں اور بدعہدیوں کی داستان کو دہراتے ہوئے اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کیا اور ہندوؤں سے اپیل کی کہ انگریز کے خلاف ہم سے مل کر جدوجہد کریں۔ جب میری تقریر ختم ہوئی تو بعض ہندو لیڈر بالکل چراغ پا ہو گئے۔ چنانچہ سب سے پہلے مسز بیسنٹ اٹھیں اور ایک نہایت زوردار تقریر میں انھوں نے میری مخالفت کی اور پانیر کے بعض اقتباسات پڑھ کر سنائے اور کہا کہ کیا ہم اس قوم کے ساتھ تعاون کریں جو ہماری لڑکیاں اٹھائے جانا اور انھیں لونڈی غلام کے طور پر فروخت کرنا اپنا مقدس مذہبی فریضہ سمجھتی ہے۔ ان کے بعد لالہ لاجپت رائے نے نہایت زوردار الفاظ میں مسلمانوں پر یہ الزام

لگایا کہ یہ ہندو کو لوٹنا اور اس کی عزت وحرمت کو پامال کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں اور اپنی تائید میں وہی سول اور پانیر کی سرکاری اطلاعات پیش کیں۔ ان کے بعد غالباً پنڈت مالویہ یا کوئی اور ہندو لیڈر بولے۔ بس پھر کیا تھا۔ جلسہ کا رنگ ہی اکھڑ گیا اور خود گاندھی جی پریشان ہو گئے۔ اس پر میں صاحب صدر کی اجازت سے اٹھا اور میں نے بھی نہایت زوردار تقریر میں انگریزوں کے جھوٹ کا پول کھولا۔

میں نے کہا کہ آپ سب لوگ مجھ سے زیادہ اس تاریخی حقیقت سے واقف ہیں کہ انگریزی سیاست کا محور ہی (Divide and rule) (ہندو مسلمانوں کو لڑاؤ اور ہندستان پر حکومت کرو) ہے۔ اس غرض کے لئے اس نے ہماری ساری تاریخ کو مسخ کر کے ہندو مسلمانوں کی رزم آرائیوں کی ایک مسلسل داستان کے طور پر پیش کیا ہے اور ہم لوگ باوجود اس علم ویقین کے کہ انگریز یہ تمام جھوٹ محض ہمیں لڑانے کے لئے گھڑ رہا ہے پھر بھی ان اکاذیب کو باور کر کے ایک دوسرے سے دست وگریبان ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کی آج کی تقریروں سے میں انگریز کی دانشمندانہ سیاست کا قائل ہو گیا کہ بمصداق۔

عیب کردن راہنرے باشد

انھوں نے یاغستان کے متعلق کس خوبصورتی سے جھوٹا پروپگنڈا کیا ہے کہ مسز اینی بسینٹ اور لالہ لاجپت رائے جیسے انگریزی امپیریلزم کے دشمن بھی اس کے دام تزویر میں پھنس گئے ہیں چونکہ میں یاغستان میں اس تحریک کا لیڈر رہ چکا ہوں اور مجھے ان مزعومہ ڈاکوں کا ذاتی علم ہے اس لئے میں پورے وثوق سے یہ کہتا ہوں کہ انگریزی رپورٹیں محض من گھڑت اکاذیب کا طومار ہیں اور میں انگریز کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ مجھ پر عدالت میں مقدمہ چلائے تاکہ مجھے موقع مل سکے کہ ان اطلاعات کا تار و پود بکھیر کر ثابت کروں کہ وہ سفید جھوٹ ہیں۔ چنانچہ میں دعوے

سے کہتا ہوں کہ یہ ڈاکے نہیں شب خون تھے اور ان میں کسی ہندو پر حملہ نہیں کیا گیا کسی ہندو لڑکی کو اغوا نہیں کیا گیا، کسی بارات کو نہیں لوٹا گیا۔ ان کا مقصد تو صرف انگریز کو پریشان کرنا اور نقصان پہنچانا تھا۔ ہندوؤں نے ہمارے ساتھ ان شب خونوں میں تعاون کیا ہے اور برابر کے شریک رہے ہیں۔ یہ محض انگریزی پروپیگنڈا تھا کہ کس طرح اسے ہندو مسلم سوال بنا کر ان کو آپس میں لڑایا جائے اور ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچا کر تحریک آزادی کو کچل دیا جائے۔ اس کام کے لئے گورنمنٹ انگریزی کے چند تنخواہ دار غنڈے ملازم ہیں۔ وہ ان کے اشاروں پر کسی ہندو لڑکی کو چھیڑ دیتے ہیں اور خود روپوش ہو جاتے ہیں۔ بس ایسے فرضی واقعات کو لے کر رائی کا پہاڑ بنا کر ہمارے مجاہدین کے سر چپکا دیا جاتا ہے۔

قصہ مختصر میں نے اس قدر وضاحت سے انگریزی پروپیگنڈا کا پول کھولا کہ مسز بیسنٹ اور لالہ لاجپت رائے کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ غلطی پر تھے۔ اور گاندھی جی نے ایک نہایت جوشیلی تقریر میں کہا کہ میں بھائی محمد علی کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو سچ اور حقیقت پر مبنی خیال کرتا ہوں اور میں ان کے ساتھ اس چیلنج میں شریک ہوں کہ اگر وہ جھوٹے ہیں تو گورنمنٹ ان پر مقدمہ چلائے۔ خیر۔ اس جلسہ کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ریزولیوشن پاس ہو گیا۔ مگر میں دل ہی دل میں انگریز کی حکمت عملی کی داد دیتا رہا کہ کس ہوشیاری اور دوراندیشی سے انھوں نے باغستان کو بدنام کیا اور مجاہدوں کے گروہ کو ڈاکوؤں اور غنڈوں کا غول ثابت کرنے کی کوشش کی۔ افسوس موجودہ زمانہ کی رقابتیں اور نفرتیں تقریباً نوے فی صدی اسی جھوٹے پروپیگنڈا کا نتیجہ ہیں۔ اگر آج ہم کسی طرح سے جھوٹے پروپیگنڈا کو دنیا کی سیاست سے خارج کر دیں تو بنی نوع انسان امن اور اطمینان کا سانس لینے لگیں۔ مگر حکومتیں اپنے اغراض

مشئومہ کے پورا کرنے کے لئے یا حکومتوں کے لیڈر اور ارباب اقتدار اپنی ہوا و ہوس کی خاطر غلط اور جھوٹا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں اور بے دریغ حق و صداقت کا خون کرتے رہتے ہیں۔

آمدم بر سر مطلب۔ ہم نے مختلف جگہوں سے انگریزی سرحدات پر چھاپے مارنے شروع کئے۔ مجھے ان چھاپوں کی تفصیلات یاد نہیں۔ ہاں اگر انگریزی اخبارات کے پچھلے فائل دیکھے جائیں تو ان کی جھوٹی رپورٹوں سے کسی حد تک سچی رپورٹیں مرتب کی جا سکتی ہیں، لیکن قارئین کرام کی دل چسپی کے لئے دو ایک جو مجھے اچھی طرح سے یاد ہیں درج کرتا ہوں۔ ایک دفعہ ہم نے مچنی کے تھانہ پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا۔ مچنی کا تھانہ شب قدر کے قلعہ کی حفاظت میں ہے اور چند میل دور علاقہ کے اندر واقع ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے انگریزوں نے برقائے ہوئے کانٹوں والے تار لگا رکھے تھے اور ان کے قریب جاتے ہی انسان تاروں کی طرف کھنچ کر گر پڑتا تھا اور برقی صدمہ سے جان بحق ہو جاتا تھا۔ میں نے پہلے تو ایسی قینچیاں بنائیں جو ان تاروں کو کاٹ سکتی تھیں۔ چنانچہ ان کو کاٹ کر راستہ بنایا۔ پھر تجویز کی گئی کہ شب خون مارنے والی جماعت کے دو حصے کئے جائیں۔ چھوٹا حصہ مچنی کے تھانے کو گھیر کر فائر کرنا شروع کر دے اور بڑا حصہ شب قدر اور مچنی کی درمیانی پختہ سڑک کے دونوں طرف گھنے درختوں میں چھپ جائے۔ رات اندھیری تھی۔ مچنی کے تھانہ والوں نے شب قدر کے قلعہ کو شیشہ کے ذریعہ حالات سے اطلاع دی۔ وہاں سے کمک ان کی مدد کے لئے گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلی۔ ان کے ساتھ کئی خچریں کارتوسوں کی تھیں جس وقت رسالہ عین وسط میں پہنچا تو ہمارے آدمیوں نے کمین گاہوں سے اس پر فائر کرنے شروع کئے۔ رات کی تاریکی نے سواروں کو پریشان کر دیا اور وہ تتر بتر ہو کر رات کی سیاہی میں غائب ہو گئے۔ کارتوسوں کی لدی ہوئی خچریں وہیں رہ گئیں۔ ان میں سے

بعض زخمی ہو گئی تھیں، لیکن ہم سب کارتوسوں کو لے کر واپس آ گئے۔ ہمیں اپنے منصوبہ کی کامیابی اور انگریز کی ہزیمت پر مسرت ہوئی۔ چند روز بعد اس شبخون کی انگریزی تفصیل پڑھ کر ہمیں بہت ہنسی آئی کہ انگریز اپنی ہزیمت کو چھپانے کے لئے کیسے کیسے جھوٹ اختراع کرتا ہے۔ اس میں یہ بھی تھا کہ انگریز نے ہماری ناکہ بندی (Blocade) کر دی ہے۔ اس ناکہ بندی کی کیفیت یہ تھی کہ ہمارے یہاں ہندوستان کی تمام تجارتی اشیا پشاور سے قدرے قلیل زیادہ نرخ پر ملتی تھیں اور یہ زیادتی بھی اس لیے تھی کہ تمام سامان گدھوں اور خچروں پر لد کر آتا تھا۔ ہر قسم کا کپڑا جس کی ہمارے یہاں کھپت تھی بافراط ملتا تھا۔ چینی، چائے، دالیں، پشاور کی سبزیاں وغیرہ انگریزی ادویہ، جاپانی کھلونے، مٹھائیاں، ہندوستانی اور انگریزی دونوں قسم کی۔ غرض استعمال کی تمام چیزیں یعنی (Consumer's Goods) سبھی ملتی تھیں، لیکن انگریز برابر اخباروں میں یہی ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا کہ ہماری ناکہ بندی سے یاغستانی قبائل تنگ آ گئے ہیں۔ بالآخر ایک دن یہ خبر شائع ہوئی کہ قبائلیوں نے معافی مانگ لی ہے اور آئندہ نیک چلنی کی ضمانت دی ہے اس لئے ان کی ناکہ بندی ختم کر دی گئی ہے۔ قصّہ مختصر انگریزی اخبارات کی خبریں ہمارے متعلق ہمارے لیے خاص تفریح کا سامان مہیّا کرتی تھیں۔

بندوق کے نشانہ میں قبائلیوں کی مہارت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا اور جرمن نشانچیوں کا کہنا تھا کہ یہ لوگ دنیا کے بہترین نشانچیوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ یہ تو کئی دفعہ ہوا کہ رات کے وقت انگریزی تھانہ کے کسی گارڈ نے سگریٹ سلگایا۔ ہمارے نشانچی نے سگریٹ کی روشنی دیکھ کر گولی چلائی۔ سپاہی کے منہ سے گولی پار ہو گئی اور وہ وہیں گر کر ڈھیر ہو گیا۔ اس لئے گورنمنٹ انگریزی نے نہایت سخت احکام جاری کر دئے تھے کہ رات کے وقت کوئی شخص سگریٹ یا دیا سلائی نہ

سلگائے اور نہ کوئی اور روشن چیز باہر نکالے تاکہ قبائلی بندوق کا نشانہ نہ بنا سکیں۔
ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک مسلّح موٹر نے ہمارے آدمیوں کا تعاقب کیا۔ اس زمانے میں مسلّح موٹریں موجودہ زمانے کی مسلّح موٹروں کی طرح گولی پروف نہیں ہوتی تھیں۔ ڈرائیور کے لئے ایک روزن سا ہوتا تھا۔ ہمارے ایک نشانچی نے اس روزن میں تاک کر گولی ماری۔ ڈرائیور وہیں ڈھیر ہوگیا۔ موٹر رکی اور دوسرا آدمی اس کی جگہ آگیا۔ ابھی موٹر اسٹارٹ بھی نہ ہوئی تھی کہ دوسرے فائر نے دوسرے ڈرائیور کو بھی عدم آباد پہنچا دیا۔ اسی طرح تیسرے کو بھی فنا کی گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس پر وہ گورے موٹر کے پیچھے سے فرار ہو گئے اور اسے وہیں چھوڑ گئے۔ ہم نے جا کر موٹر کار پر قبضہ کر لیا لیکن چونکہ ہمارے لیے وہ بیکار تھی اس لئے اس کے کارتوس اور بندوقیں تو ہم لے آئے اور موٹر کو توڑ پھوڑ کر بیکار کر آئے۔

غرض ایسے واقعات اس زمانے میں روزانہ ہوتے رہتے تھے جس سے ایک تو ہم انگریز کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ دوسرے ان قبائلیوں کی توجہ ہم نے محض لوٹ مار سے ہٹا کر انگریز کی دشمنی کی طرف مبذول کر دی تھی۔ ہم بار بار ان لوگوں کو سمجھاتے رہتے تھے کہ خبردار کسی ہندو کو مت ستانا، کسی عورت کو اغوا مت کرنا، کسی قافلے کو مت لوٹنا کیونکہ اس سے ہمارا جہاد فی سبیل اللہ کی بجائے فی سبیل الطاغوت ہو جائے گا اور مجھے یاد ہے کہ باوجودیکہ وہ لوگ پورے منظم تھے اور لوٹ مار میں یگانہ تھے، بلکہ لوٹ مار ان کی آمد کا اچھا خاصہ ذریعہ تھی، مگر پھر بھی انھوں نے ہمارے احکام کو بے چون وچرا تسلیم کیا اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے لشکریوں نے سوائے انگریز کے کیمپ پر شبخون مارنے کے اور کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا۔ یہ صحیح ہے کہ لوٹ مار ان لوگوں کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اور

ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ان کی واقعی یہی حالت تھی کہ اپنے اور پرائے میں تمیز نہ کرتے تھے۔ اگر لوٹ مار کے لئے پرائے نہ ملے تو اپنوں کو بھی لوٹنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ اور اس طرح ان میں قبائلی لڑائیاں شروع ہو جاتی تھیں جن کی مثال عربوں کی حرب داحس یا بکر و تغلب کی لڑائی کی سی تھی لیکن ہم نے وہاں پہنچ کر ان کو ایک راہ دکھادی تھی کہ آپ بے شک لوٹ مار کریں لیکن صرف انگریز کو یا انگریز کے متعلقہ آسامیوں کو لوٹیں۔ انگریزی رعایا کو اور ہندوؤں کو نہ لوٹیں۔ اور ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں۔ چنانچہ اس کا بفضلہ بہت اچھا اثر ہوا مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب کوئی قبائلی میرے پاس اپنے کسی بھائی کی شکایت لے کر آتا تو میں اس سے کہتا کہ بھئی اسے انگریز کے کھاتے میں لکھ لو۔ وہ حیران ہو کر پوچھتا کہ وہ کیا ہے میں کہتا کہ اس کا بدلہ انگریز سے لو۔ یہ میرا جملہ وہاں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ اب تک وہ لوگ اسے یاد کرتے ہیں کہ "بڑے مولوی صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ دشمن صرف ایک ہے باقی سب دوست ہیں۔ اس لئے جب تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس کا بدلہ انگریز سے لو"

میں یہ باتیں اپنی موجودہ ذہنی کیفیت کی رو سے نہیں لکھ رہا بلکہ میری حتی الوسع یہی کوشش ہے کہ اپنے اس دور کی ذہنی کیفیت کا صحیح نقشہ کھینچنے کی کوشش کروں لیکن ابتدا میں تو مجھے یہ بات بہت مشکل معلوم ہوئی مگر جوں جوں میں لکھتا جا رہا ہوں اس زمانے کے کہنہ نقوش از سر نو ابھر رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ میں اُس زمانے کے جذبات کی ترجمانی خاص محنت سے کر رہا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے۔

شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

میرے لئے ہی کہا تھا وہ واقعات حیرت انگیز تسلسل کے ساتھ اب میرے سامنے آ رہے ہیں اور اگر میں انھیں تفصیل سے قلمبند کرنا شروع کر دوں تو شاید ایک

پوری کتاب مدون ہوجائے۔

بالجملہ ہمارا صوات کا دورہ بھی بہت کامیاب رہا اب میں دیر اور امب کے علاقے میں داخل ہوا۔ نواب امب انگریزوں کا باجگزار تھا اور انگریزوں سے بہت خائف تھا، مگر اسے بھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ ہمیں روک دیتا بلکہ جب بھی میں امب گیا تو نواب صاحب نے مجھے اپنے مہمان خانہ میں ٹھیرایا اور رات کے گیارہ یا بارہ بجے کے قریب مجھ سے اور ملا بشیر صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے آئے۔ نواب امب نہایت خوش گفتار اور خوش وضع نوجوان تھے۔ مگر انگریزی اثر نے انھیں عیش وعشرت کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ بہت دیر تک ان سے ہماری کھلی کھلی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے انھیں اپنی تمام اسکیم سے مطلع کیا۔ انھوں نے بھی امیر عبدالجبار صاحب کی طرح امیر حبیب اللہ کی ذات کے متعلق شکوک پیش کئے وہ شکوک بالکل بجا تھے۔ وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ "میں تو اپنا سر دھڑ بلکہ ریاست تک اسلام پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ کوئی لیڈر ایسا ہو جو امیر حبیب اللہ کی طرح خود غرض، لالچی اور عبدالدنیا نہ ہو"۔ ہم ان کی بات کی تردید نہ کرسکتے تھے۔ اس وقت رہ رہ کر میرے دل میں یہ خیال آتا کہ امیر حبیب اللہ کے پاس خود جاؤں اور انھیں اصل حالات سے مطلع کروں کہ آپ بھی سال (۱) کی طرح آلوؤں کی ایک پلیٹ کے عوض اتنی بڑی سلطنت سے ہاتھ دھو رہے ہیں۔ مگر میرا کابل جانا تو خارج از بحث تھا جب ملا بشیر اور

(۱) سال Saul توریت کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے اور ابراہیمی قانون کے مطابق وارث نبوت وسلطنت تھے۔ ایک دن انھیں سخت بھوک لگی تھی تو حضرت یعقوب سے انھوں نے کہا کہ مجھے ایک آلوؤں کی پلیٹ دو اور میں اس کے عوض میں اپنے حق سلطنت اور نبوت سے دستبردار ہوجاتا ہوں۔ چنانچہ حضرت یعقوب وارث بن گئے اور سال نبوت اور سلطنت دونوں سے محروم ہوگئے

نائب السلطنت امیر صاحب کو راہ راست پر نہ لاسکے تو میں کس شمار میں تھا۔

دیر اور امب کا علاقہ بھی پہاڑی علاقہ ہے۔ آب و ہوا نہایت خوشگوار اور عمدہ جگہ جگہ چشمے ابل رہے ہیں اور پہاڑی نالوں نے زمین کو خاصہ زرخیز بنا دیا ہے۔ ان پہاڑی نالوں میں مچھلی کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ میں حیران ہو گیا۔ چنانچہ میں خود ہفتہ میں ایک دو بار مچھلی کا شکار کھیلا کرتا تھا۔ اور اتنی مچھلیاں پکڑتا کہ مجاہدین کے ہر گھر کو مچھلی کا حصہ جاتا۔ مچھلی پکڑنے کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ بعد میں مجھے خود اس امر کا احساس ہوا کہ یہ طریقہ بہت بے رحمانہ ہے اس لئے میں نے اسے ترک کر دیا اور جال سے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ وہ طریقہ یہ تھا۔

ڈائنامیٹ (Dynamite) کے انگریزی کارتوس Cartridges ہوتے ہیں۔ یہ بتیاں یا قلم بڑی موم بتی کے برابر موٹی، مگر طول میں نصف ہوتی ہیں ایک طرف ان کے پلیتہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ اب اس بارود کی بتی کو گیلے آٹے کے ایک گولے میں دبا دیتے ہیں اور صرف پلیتہ کو باہر رکھتے ہیں۔ اس گولے کو ایک مضبوط رسی کے ساتھ باندھ لیتے ہیں۔ شکار کا طریقہ یہ ہے کہ وہ نالے چونکہ بہت تیز رفتار ہوتے ہیں اس لئے جہاں کہیں راستہ میں کوئی چٹان ہوتی ہے وہاں پانی کا ایک گہرا حلقہ اس پتھر کے گرد بن جاتا ہے مچھلیاں بالعموم اس گہرے پر سکون پانی میں جمع رہتی ہیں۔ اب اس پتھر پر کھڑے ہو کر پلیتہ کو آگ لگا کر اس گولے کو پانی میں پھینک دیتے ہیں۔ پانی کے اندر جا کر وہ ڈائنامیٹ نہایت زور سے پھٹتا ہے۔ اس کے دھماکے سے سینکڑوں مچھلیاں بے ہوش ہو جاتی اور سطح آب پر تیرنے لگتی ہیں۔ بس اس کے تھوڑی دور نیچے پانی کی رو کی طرف چند آدمی کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ وہ مچھلیوں کو پکڑ پکڑ کر ٹوکروں میں ڈالتے جاتے ہیں۔ اس طرح بڑی چھوٹی مچھلیاں سینکڑوں کی تعداد میں ایک ہی دفعہ پکڑی جاتی ہیں۔ چنانچہ مجھے یاد ہے

کہ ایک دفعہ صرف بڑی مچھلیوں کی تعداد گیارہ سو تھی۔ میں نے مجاہدین کے تمام گھروں میں مچھلیاں بانٹیں وہ لوگ بہت خوش ہوئے کیونکہ وہ بالعموم بنگالی ہوتے تھے اور مچھلی ان کی بہت مرغوب غذا تھی۔

بیر کی زمین بھی بہت زرخیز اور آب و ہوا نہایت معتدل اور عمدہ ہے۔ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں خطے کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہی ہیں۔ زیادہ تر وہاں تلی، جوار، گیہوں، چاول پیدا ہوتے ہیں۔ مسور کی بکثرت کاشت ہوتی ہے۔ کیونکہ مسور کی دال ان لوگوں کا من بھاتا کھانا ہے۔ اکثر گھروں میں گائے بھینس بھی ہوتی ہے اور لوگ ان کا دودھ، دہی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ شہد بھی بکثرت ملتا ہے اور وہاں شہد کی تری مکھیوں کی باقاعدہ پرورش ہوتی ہے، یہاں تک کہ بچی کو جہیز میں مکھیوں کی جوڑی دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے گھر میں شہد کا چھتہ لگا سکے۔ قریباً ہر گھر میں شہد کی مکھیوں کا بڑا چھتہ ہوتا ہے جو ایک طاقچہ میں بند ہوتا ہے۔ طاقچہ میں ایک چھوٹا سا روزن باہر کی طرف ہوتا ہے۔ اس روزن سے شہد کی مکھیاں باہر پھولوں سے رس چوسنے کے لئے روزانہ نکل جاتی ہیں۔ اندر اس طاقچہ کا راستہ ہوتا ہے، جہاں گھر والوں کو شہد کی ضرورت ہوئی انھوں نے طاقچہ میں دھنواں کیا۔ مکھیاں باہر نکل جاتی ہیں۔ وہ خود اس میں سے ایک اچھا خاصہ ٹکڑا مع موم کے کاٹ لیتے ہیں اور مہمان کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

اسی علاقے میں حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ کی جماعت ایک مقام اسمست میں مقیم ہوگئی تھی۔ جب ہری سنگھ نلوہ نے ۱۲۳۹ھ میں چند پٹھانوں کی غداری سے حضرت سید احمد صاحب کی کمین گاہ بالاکوٹ پر حملہ کردیا تو وہ پانچ ہزار سر فروش مجاہدین کی جماعت سکھوں کے ایک لشکر عظیم کے مقابلہ پر ڈٹ گئی گو ان کی تعداد قلیل تھی مگر وہ اس قدر بہادری سے لڑے کہ سکھوں

کے دانت کھٹے ہو گئے۔ حضرت سید احمد صاحب اور حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب دونوں نے اس معرکے میں جامِ شہادت نوش کیا۔ پانچ ہزار میں سے قریباً دو تہائی وہیں شہید ہوئے باقی ماندہ افراد پہلے تو تتر بتر ہو گئے مگر پھر امب کے راستے سے اسمست کے مقام پر جاکر پناہ گزیں ہو گئے اور نئے سرے سے جماعت مجاہدین کی تنظیم و تشکیل میں مصروف ہو گئے۔ ان کی لیڈرشپ حیرت انگیز لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے فوراً ہی اپنے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر اسلامی حکومت قائم کرنا۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے حیرت انگیز نظم و ضبط کا ثبوت دیا اور پٹنہ سے لے کر مدراس اور بنگلور تک اور پنجاب اور دہلی سے لے کر بنگال و آسام تک اسی جماعت کی شاخوں کا ایک جال بچھا دیا ہر شاخ انگریز کے خلاف جہاد کی تلقین کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ اس جماعت کی تاریخ ہندوستان کے جہادِ حریت کے ضمن میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ مولانا ولایت علی صادق پوری اور ان کے برادرِ اصغر مولانا عنایت علی صادق پوری۔ حضرت سید صاحب کے سچے جانشین تھے۔ اِن لوگوں نے تقویٰ اور طہارت میں ایسی درخشاں مثالیں قائم کی ہیں کہ بلامبالغہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد میمنت مہد کے بعد کوئی جماعت جوشِ جہاد، ایثار و خدومیت کا ان سے بہتر نمونہ پیش نہیں کر سکتی۔ وہ اخلاق محمدی کا پیکر تھے اور اسلامی تعلیمات کی تصویر۔ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا اور ہندوستان میں اِن کے خلاف ایک زبردست جماعت پیدا کرنا اِن لوگوں کے وظائف حیات تھے۔ وہ سرتاپا صداقت اور ایثارِ مجسم تھے۔ عورتیں اپنے بچوں کو جہاد کے لئے وقف کر دیتی تھیں۔ اپنے زیور اور کپڑے تک اتار کر دے دیتی تھیں کہ مجاہدین کے لئے ہتھیار خریدے جائیں۔ انگریز اِس جماعت سے اس قدر خائف تھا کہ جب وہ سیاسی ہتھیاروں سے ان پر قابو نہ پا سکا تو اس نے وہابیت کا ڈھونگ کھڑا کیا۔

اور اِس جماعت کو وہابی کہہ کر بدنام کرنا شروع کیا تاکہ لوگوں کو اس جماعت کے ساتھ لگاؤ نہ رہے۔ چناں چہ بریلی کے ایک مولوی کو (غالباً ان کا نام غلام رسول تھا) ۵۰۰ روپیہ ماہوار پر ملازم رکھا اور انھیں اختیار دیا کہ جتنے مولوی چاہیں ملازم رکھ لیں۔ چنانچہ ان سرکاری تنخواہ دار مولویوں کا ایک پورا گروہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گیا اور مسجدوں میں پبلک جلسوں میں انھوں نے حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب شہید کی تکفیر اور ان کی وہابیت کی تشہیر کرنی شروع کی۔ ان کے خلاف جھوٹے الزام تراشے گئے اور شاید روس نے سرمایہ دار ممالک کے خلاف اور سرمایہ دار ممالک نے روس کے خلاف اتنا جھوٹا اور اتنا زہریلا پروپیگنڈا کیا ہوگا جتنا کہ اس جماعت کے خلاف انگریز کے تنخواہ دار اجیروں نے کیا[1]

اس کے ساتھ ساتھ انگریز نے وہابی تحریک کو کچلنے کے لئے ہر قسم کا تشدّد اور دباؤ بھی استعمال کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اگر کسی شخص کو کسی شخص کے خلاف دشمنی ہوتی تو وہ جا کر جھوٹ موٹ بھی کلکٹر سے کہہ دیتا کہ فلاں شخص وہابی ہے تو اس کو پھانسی پر لٹکا دینے کے لئے یہ کافی تھا۔ ۱۸۶۹ء کا وہابی کیس اور اس کے بعد کئی

---

[1] حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا نام نامی خاص طور پر اس لئے ہدفِ مطاعن بنایا گیا کہ اول تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے پوتے تھے اور اس خاندان کا علمی فیضان تمام اطرافِ عالم میں، یہاں تک کہ مصر و حجاز میں بھی پہنچ چکا تھا اور قریباً ہر عالم حدیث اس خاندان سے تعلق رکھنے کو اپنا سرمایۂ افتخار خیال کرتا تھا۔ اس لئے شاہ صاحب کو بدنام کرنے سے ساری تحریک کی جڑ کٹ جاتی تھی۔ دوسرے اکثر کتب شاہ صاحب کی ہی تصنیف ہیں۔ اس سے اکثر ہندوستانی زعما یہاں تک کہ مولانا آزاد وغیرہ کو بھی یہ غلط فہمی ہو گئی کہ اصل بانی اس تحریک کے وہی تھے۔

اور مقدمات انگریز کی انتقامی کارروائیوں کی زندہ شہادت دے رہے ہیں۔ ان کی تفصیلات ہنٹر کی مشہور کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" (Our Indian Mussalmans) میں مذکور ہیں۔ اور فی الواقع یہ حیرت انگیز امر ہے کہ ہنٹر نے نہایت دیدہ دلیری سے اس کتاب میں اکاذیب و اباطیل کا ایک طومار جمع کر دیا ہے۔ یہاں موقع ہنٹر کے سفید جھوٹ کی قلعی کھولنے اور اس جماعت کے زریں کارناموں کے بیان کرنے کا نہیں ہے کیوں کہ ہم اپنے موضوع سے بہت دور جا پڑیں گے۔ مگر قصہ مختصر انگریز کا انتہائی تشدد اس جماعت کی سرگرمیوں کو کم نہ کر سکا۔ بلکہ :-

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب

بڑھتا ہے اور ذوقِ گناہ یاں سزا کے بعد

اور باوجود ہر قسم کے تشدد کے اس جماعت کی ہر دلعزیزی بڑھتی رہی اور ہندوستان سے روپیہ اور آدمی برابر اسمست جاتے رہے۔ چنانچہ جب میرا تعارف مولوی ولی محمد صاحب مرحوم سے ہوا تو اس وقت وہ تقریباً پنجاب سے ایک لاکھ روپیہ سے زائد سالانہ جہاد کے لیے اسمست بھجواتے رہے اور سینکڑوں آدمی سالانہ ہجرت کر کے اسمست یا کسی اور اسلامی ملک میں جا کر آباد ہو جاتے تھے۔ مہاجر لڑکوں کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں۔ وہ نوجوان بھی اس جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے تھے۔

لیکن افسوس کہ جب اس جماعت کی عنان اہل لوگوں کی بجائے نااہل لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی تو اس میں بھی فساد اور خسران کے جراثیم پرورش پانے لگے۔ اور گو ہندوستان کے لوگوں کو اصل واقعات کا علم نہ تھا لیکن مرکز کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔

فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات (مریم)
(ان کے جانشین ایسے لوگ ہو گئے جنھوں نے اپنی نمازوں کو ضائع کر دیا اور خواہشات نفسانی کی پیروی میں منہمک ہو کر مقصد سے دور ہو گئے)

کے منطوق کے مطابق ایسے زبردست اسلاف کے جانشین نہایت نالائق اور نااہل لوگ بن گئے جنھوں نے عقیدت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس روپیہ کو جو جہاد کے لئے بھیجا جاتا تھا اپنی عیش پرستیوں کے لئے برباد کرنا شروع کیا۔ چونکہ اِس جماعت کے سرحدی لیڈروں کی سرگرمیاں پچھلے پچاس سال میں نہایت ہی شرمناک رہی ہیں اور وہ عام مشائخ اور پیروں کی طرح ہر قسم کے فریب اور جھوٹ سے اپنی دکان کی رونق بڑھاتے رہے ہیں اور ہندستان کے نہایت مخلص آدمیوں کو بھی اپنا آلۂ کار بنانے سے نہیں چوکے (اور میں خود بھی ان کے فریب کا شکار رہ چکا ہوں) اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان کے پوست کندہ حالات بیان کروں اور مجھے ان کے درمیان رہ کر جن حالات کا علم ہوا انھیں جماعتِ اہلحدیث اور عام مسلم پبلک کے فائدے کے لئے بے نقاب کر دوں تاکہ لوگ آیندہ ان کی دھوکہ بازیوں سے بچیں اور مسلمانوں کی تنظیم میں ان ٹھوکروں سے بچیں جن کی وجہ سے جماعتِ مجاہدین اس درجہ بیکار ہو گئی۔ فی الحقیقت ان کی مثال بھی معمولی پیروں کی سی ہو گئی جو گدی بنانے کے لئے ہر قسم کا جھوٹا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

بیرم میں پہنچ کر مجھے امیر المجاہدین امیر نعمت اللہ صاحب کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ میں ان کے صدر مقام میں ضرور آؤں، اور اس میں یہ بھی تھا کہ ایک نہایت عمدہ مکان میرے لئے تیار ہے۔ مجھے بھی خاص مسرت محسوس ہو رہی تھی کہ جس جماعت کے ساتھ میرا اتنا پرانا تعلق رہا ہے اس جماعت کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس پر یہ بھی خوشی تھی کہ اپنے سیاسی گرو مولوی ولی محمد صاحب

سے بھی جو ہجرت کر کے اسمست آچکے تھے شرفِ ملاقات ہوگا۔

مولوی ولی محمد صاحب مرحوم سے مجھے بے حد عقیدت تھی۔ ان کی زندگی سرتاپا جہاد تھی اس لئے میں مشتاق تھا کہ دیکھوں کہ مولوی صاحب اپنے صحیح ماحول میں پہنچ کر کیا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جب میں اسمست پہنچا تو خود امیر نعمت اللہ صاحب اور ان کے بھائی مولوی رحمت اللہ صاحب اور مولوی ولی محمد صاحب اور دیگر اراکین جماعت نے میرا پُر خلوص خیر مقدم کیا۔ مجھے جلد ان کی مسجد میں لے گئے جہاں تمام مجاہدین جمع تھے۔ جہاں امیر نعمت اللہ نے ایک مختصر مگر نہایت شستہ اُردو میں تقریر کی اور میرا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ ہمیں مولوی صاحب کی ذات سے بہت زیادہ توقعات ہیں۔ یہ جماعت کے پرانے خادم ہیں اور اب ہمارے پاس آئے ہیں۔ امید ہے کہ ان کے مشوروں سے جماعت دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے گی۔ میں نے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ جلسہ برخاست ہوا۔ اور میں اپنے مکان میں چلا گیا۔ میرا مکان بستی سے باہر مگر مسجد سے بالکل قریب تھا اور رات کے وقت بستی کے پہرہ دار کی اقامت گاہ کے بالکل سامنے تھا۔ مکان میں ایک کمرہ۔ ایک باورچی خانہ، ایک پاخانہ، ایک غسل خانہ اور ایک اچھا خاصہ صحن تھا۔ اس کا محل وقوع نہایت پر فضا تھا۔ دامنِ کوہ میں واقع تھا اور عین اس کے نیچے کوئی دو سو گز کی اترائی پر ایک خاصہ بڑا پہاڑی نالہ برندو بہتا تھا۔ اس کا پانی نہایت شفاف شیریں اور ٹھنڈا تھا، اور ایسی تیزی سے بہتا تھا کہ باوجودیکہ وہ زیادہ گہرا نہ تھا پھر بھی اسے عبور کرنا خاصا مشکل تھا، گو ہم لوگ اسے اکثر عبور کرتے رہتے تھے۔ برندو میں مچھلیاں اس کثرت سے تھیں کہ مجاہدین کے لئے اچھا خاصا لحماً طریاً (تازہ گوشت) مہیا کرتی تھیں۔ میں نے اوپر مچھلی کے شکار کے متعلق جو لکھا ہے وہ اسی نالے کی مچھلیوں کے متعلق تھا ہم اس میں اکثر مچھلی کا شکار کھیلتے۔ اس نالے کے پار

ایک نہایت سرسبز اور خوبصورت سلسلۂ کوہ تھا جو دریائے سندھ کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔ اس سلسلۂ کوہ پر ایک نہایت خوبصورت اور دلفریب خودرو قدرتی بنفشہ زار تھا جو بلا مبالغہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کھیت کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ بے انتہا فرحت ہوتی اور میں خواجہ حافظؒ کا مشہور شعر اکثر پڑھا کرتا تھا۔

گزار کن چو صبا بر بنفشہ زار و ببیں
کہ از تطاول زلفت چہ سوگوار انند

میں نے اکثر دیکھا کہ نسیمِ سحر جب چلتی تھی تو بنفشہ کے خوبصورت پھول اور اس کی نرم نرم پتیاں جھومنے لگتیں شاید لسان الغیب نے اس نظارہ کو اپنے شعر میں بیان کیا ہے۔ بنفشہ کے تازہ پھولوں کی چائے اس قدر خوش ذائقہ اور خوشبو دار ہوتی ہے کہ معمولی چائے کی پیالی اس کی برابری نہیں کرسکتی۔ بنفشہ کی تازہ پتیوں کا لیپ میں نے رستے ہوئے داد (Wet Eczema) کے لئے بہت ہی مفید پایا۔

چاندنی رات میں بنفشہ زار اور بھی دلفریب معلوم دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ایک بنفشی چادر ہے جو قدرت نے میدان میں بچھا دی ہے ان پگڈنڈیوں میں ہم نے اکثر چکور کو چاند کی طرف دیکھتے ہوئے اور اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے پایا۔ چکور بھی نہایت خوبصورت پرندہ ہے اور رات کے وقت اس کی صبا رفتاری گھوڑے کو بھی مات کرتی تھی۔ اکثر قبائلی چکور کا شکار رات کے وقت کھیلتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اس کا راستہ متعین کرکے درمیان میں جال لگا دیتے ہیں۔ وہ رات کے وقت نکلتا ہے اور چاند کو پکڑنے کے لئے دوڑنا شروع کرتا ہے۔ راستے میں جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح سے وہ لوگ ایک ایک جال میں کئی کئی چکور پکڑ لیتے ہیں۔ اس کا گوشت بھی بہت لذیذ ہوتا ہے اور ہم اکثر اس کا گوشت کھایا کرتے تھے۔

برنڈد کی تیز رفتاری سے میں اکثر تعجب کیا کرتا کہ کتنا بڑا ذخیرہ برقابی قوت

کا ضائع ہو رہا ہے۔ لیکن ایک دن میں اس کے کنارے کنارے چلا گیا تو معلوم ہوا کہ چند میل آگے جا کر وہ نالہ دریائے سندھ میں گرتا ہے اور اتنی بڑی بلندی سے گرتا ہے کہ میلوں تک اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اتنی بڑی آبشار سے ہم جتنی بھی برقابی قوت حاصل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ میں وہاں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ افسوس ہمیں قدرت نے کیسے خزانے دولت کے مفت عطا فرمائے ہیں، مگر ہماری لاعلمی اور دون ہمتی سے وہ ضائع ہو رہے ہیں۔ برنڈو کی آبشار اس زور سے دریائے سندھ میں گرتی ہے کہ میلوں تک اس تیز رفتار دریا میں بھی اس کا دھارا بالکل الگ بہتا ہے اور مچھلیاں اس کے اوپر چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے پہلی دفعہ وہاں اپنی عمر میں مچھلیوں کو آبشار کے اوپر چڑھتے ہوئے دیکھا تو معلوم ہوا کہ برنڈو میں مچھلیوں کی افراط دراصل دریائے سندھ کی مچھلیوں کی وجہ سے ہے۔

مسجد اور میرے مکان کے درمیان ایک سپاٹ قطعہ تھا جس کے ایک حصّہ میں، میں نے مختلف سبزیاں بو دی تھیں۔ کریلے، بھنڈی، ترئی، ٹنڈے، کدو، اس کثرت سے ہوتے تھے کہ نہ صرف میں یا امیر نعمت اللہ صاحب بلکہ اکثر مجاہدین ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ تعجب ہے کہ مجھ سے پہلے کبھی کسی کو خیال نہ آیا تھا کہ اس کثرت سے سبزی بوئے یا سبزیاں بھی گوشت کے ساتھ پک سکتی ہیں۔ وہ لوگ مسور کی دال اور مکی کی روٹی کے اس قدر عادی تھے کہ کسی تبدیلی کا خیال بھی ان کے دل میں نہ آتا تھا۔

میں نے اپنے مکان میں رہائش اختیار کر لی تو اب پہلی دفعہ یہ خیال کیا کہ اب جماعتی کام جم کر کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے مجھ سے اکثر احباب نے کہا کہ میں باقاعدہ

بیعت کرکے جماعت مجاہدین کے سلسلہ میں شامل ہوجاؤں۔ اس سے پہلے ملا بشیر صاحب مجھ سے اس کے تعلق کہہ چکے تھے، مگر میں نے اِس بنا پر عذر کیا تھا کہ اگر میں امیر نعمت اللہ صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا تو یاغستان کے بڑے بڑے ملا جو اب میری اِس درجہ عزت کرتے ہیں مجھ سے بدظن ہوجائیں گے اور یہ خیال کریں گے کہ میں امیر حبیب اللہ کا نام لے کر درحقیقت امیر نعمت اللہ کا پروپگنڈا کرکے لوگوں کو وہابی بنانا چاہتا ہوں۔ ملا بشیر مرحوم نے میری بات کی تائید کی اور اس کے بعد انھوں نے کبھی اصرار نہ کیا کہ میں "جماعت" میں داخل ہوجاؤں۔ لیکن ہر شخص ملا بشیر کی طرح ہوشمند نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ جب میں اسمست پہنچا تو اکثر مجاہدین جو میرے وہاں پہنچتے ہی میرے بہت بے تکلف دوست بن گئے تھے، اصرار پر اصرار کرنے لگے کہ میں باقاعدہ بیعت کرکے "جماعت" میں داخل ہوجاؤں۔ اس کے لئے مجھ پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا جاتا رہا اور شرعی دلائل بھی دیے گئے مگر میں ٹالتا ہی رہا سب سے زیادہ زور میرے محترم بزرگ اور رفیق کار مولوی ولی محمد صاحب نے (جن کا نام اب مولوی موسیٰ رکھا گیا تھا اور آئندہ ہم انھیں اسی نام سے یاد کریں گے) مجھ پر دیا۔ انھوں نے مجھے وہ مشہور حدیث سنائی۔

من مات ولیس فی عنقہ ربقۃ طاعت الامیر فقد مات میتۃ الجاھلیۃ (او کما قال)

"جو شخص مرا اور اس کی گردن میں کسی امیر کی اطاعت یعنی بیعت کا حلقہ نہیں وہ جاہلیت یعنی کفر کی موت مرا"

اور تنبیہ کی کہ اگر میں بیعت کرکے داخل جماعت نہیں ہوں گا تو میری موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ میں نے مختلف دلائل دے کر انھیں ٹالنا چاہا اور انھیں یقین دلایا کہ در اصل میں امیر حبیب اللہ صاحب کی بیعت میں داخل ہوں اور ان کی طرف سے تمام ملاؤں سے بیعتِ جہاد

لے رہا ہوں اس لئے مجھے کسی دوسرے امیر سے بیعت کرنے کی ضرورت نہیں، مگر وہ میری ایک نہ سنتے تھے اور یہی کہتے تھے کہ میں جماعت کے فوائد سے تو متمتع ہونا چاہتا ہوں مگر اس کی شرعی پابندیوں سے اپنے تئیں آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اسی وجہ سے مولوی موسیٰ صاحب مجھ سے ناراض رہتے تھے۔

میں نے امیر نعمت اللہ کے متعلق بہت سی روایات چمر کنڈ میں بھی سن رکھی تھیں۔ اس لئے پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ جب تک اچھی طرح سے خود چھان بین نہیں کر لوں گا۔ "جماعت" میں شامل نہیں ہوں گا۔ وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ حالات کہیں بدتر تھے۔ میں نے جو رپورٹیں سنی تھیں وہ غلط نہ تھیں۔ امیر نعمت اللہ اب وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں وہ احکم الحاکمین کے حضور میں اپنے اعمال کی جوابدہی کر رہے ہیں، اس لئے ہماری نکتہ چینی سے اب وہ بے نیاز ہیں، لیکن پھر بھی ان کے پبلک اعمال کو بے نقاب کرنا اس لئے ضروری ہے تاکہ مسلمانوں کا یہ مزمن مرض یعنی پیر پرستی جو انہیں گھن کی طرح کھا رہا ہے دور ہو اور وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ دنیا کس طرف جا رہی ہے اور وہ کیونکر مذہب کے دھوکے میں گندم نما جو فروش مشائخ کے پنجے میں گرفتار ہو کر تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ جماعت کے داخلے کے لئے تمام دلیلیں مذہبی دی جاتی تھیں اور وہ تقریباً وہی تھیں جو پیر و مشائخ اپنی دکانیں سجانے کے لئے اور مریدوں کا حلقہ ارادت وسیع کرنے کے لئے بیان کرتے ہیں۔

اوّل:۔ انسان کی انفرادی زندگی بھیڑ، بکریوں کی سی زندگی ہے۔ اس لئے اسلامی زندگی میں داخلہ کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے اس ماحول سے قطع تعلق کر کے نئی زندگی میں اسلامی آئیڈیلز کے گرد داخل ہو اور ایسے ماحول میں آجائے جو سرتاپا اسلامی ہو۔

دوئم:۔ بیعت کرنے پر انسان تمام جماعتی حقوق کا وارث ہو جاتا ہے اور

اگرچہ جماعتی زندگی بہت سی پابندیاں ساتھ لاتی ہے مگر اس سے جو فوائد مترتب ہوتے ہیں وہ ان پابندیوں کی تلافی کر دیتے ہیں۔

سوم: بیعت کرتے وقت انسان کو اطاعتِ امیر، رازداری، افرادِ جماعت کو بھائی اور تمام اُن لوگوں کو جو جماعت سے باہر ہوں حقیر سمجھنے یا کم از کم اجنبی خیال کرنے کا عہد لیا جاتا تھا۔

اطاعتِ امیر کا مطلب یہ تھا کہ امیر کی ذات ہر قسم کی نکتہ چینی سے بالاتر خیال کی جائے اُس کے عیوب کو حسنات سمجھا جائے، اور اس کے خلاف کسی قسم کی بری بات اپنی زبان سے نہ نکالی جائے کیونکہ اطاعت امیر کے انکار سے فسخ بیعت لازم آتا ہے اور فسخ بیعت کفر اور الحاد کے برابر ہے۔ من شذّ شذّ فی النّار (جو کوئی جماعت سے الگ ہوا، آگ میں اکیلا ڈالا جائے گا) کی وعید ایسی سخت ہے کہ کوئی شخص امیر سے لاپرواہی نہیں برت سکتا۔ اس کو جہاں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے دن سب لوگ اپنے اپنے پیروں کے جھنڈے تلے اُٹھائے جائیں گے۔ اس لیے جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی خوفِ خدا ہے وہ ایک دفعہ داخلِ بیعت ہو کر اپنے امیر یا پیر کی نکتہ چینی کرنا گناہ عظیم خیال کرتا ہے۔ چنانچہ میں نے خود دیکھا ہے کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے آدمی جب داخلِ جماعت ہو جاتے ہیں تو عقل و خرد اور ہوش و حواس کو خیرباد کہہ کر اپنے پیر طریقت یا امیر جماعت کی ہر مذموم سے مذموم فعل کی بھی تحسین یا بطریقِ تنزل توجیہ کر کے اپنے دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ اور حافظ کا یہ شعر پڑھتے ہیں۔

بہ مے سجّادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا

اِن کے خیال کے مطابق جماعتی مفاد اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر رکن

جماعت اپنا تنقیدی حق (Right of Criticism) استعمال کرے کیونکہ جماعتی مفاد کا ہر شخص کو علم نہیں ہو سکتا۔ صرف امیرِ جماعت یا شیخ طریقت ہی اس کو جان سکتا ہے یا جاننے کا حق دار ہے۔ باقی تمام ارکان کو امیر کی یا شیخ کی اندھی پیروی کرنی چاہیئے۔ جماعتی ڈسپلن کی مثال ان کے خیال میں ملٹری ڈسپلن کی سی ہے جس طرح میدانِ جنگ میں کسی سپاہی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے امیر یا کمانڈر کے حکم کی علت معلوم کئے بغیر اس کی تعمیل سے انکار کر دے۔ بلکہ ایسا کرنے والا غدار اور بھگوڑا متصور ہوگا اور اس کا کورٹ مارشل کر کے اسے گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ اسی طرح کسی جماعت کے رکن کو یہ حق حاصل نہیں کہ امیر کے حکم کے خلاف اعتراض کرے اور اس میں لامحالہ امیر کی ذات ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ٹھیرتی ہے۔ دوسری شق رازداری کی ہے۔ اس کی دلیل بھی قرآن حکیم سے دی جاتی ہے۔

> واذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہٖ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم ؕ (النساء۔ ۱۱)
>
> "اور جب ان لوگوں کو امن یا خوف کے متعلق کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو یہ اسے مشہور کر دیتے ہیں اور اگر یہ لوگ (اس خبر کو مشہور کرنے کی بجائے) رسول کے یا اپنے ارباب اختیار کے حضور میں پیش کرتے تو وہ لوگ جو ایسے امور کی چھان بین کرتے ہیں ان خبروں کی حقیقت تک پہنچ جاتے۔"

یہاں اس آیت کے اصلی منطوق پر بحث نہیں کروں گا کیونکہ میرا مقصد صرف ان لوگوں کی ذہنیت کا نقشہ پیش کرنا ہے۔ وہ لوگ کہتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ جماعتی زندگی کا اصل الاصول یہی ہے کہ جو خبر بھی معلوم ہو اسے پہلے اپنے امیر کی خدمت

میں پیش کیا جائے۔ پھر امیر کی اجازت ہو تو کسی دوسرے سے اس کا ذکر کیا جائے۔ اب اس رازداری کے اصول کو دینی لباس میں وہ اس رنگ میں پیش کرتے تھے کہ جماعت کے اندرونی حالات کسی شخص کے سامنے جو جماعت سے باہر ہو ذکر نہ کئے جائیں۔ چنانچہ جو قاصد جماعت کے ہندوستان روپیہ جمع کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ وہ یہاں خوب مبالغہ آمیز تصویر جماعت کے کارناموں کی بیان کرتے تھے۔ اس کا مقصد چندہ جمع کرنا تھا اور وہ قاصد صرف وہی باتیں بیان کرتے جو امیر حبیب اللہ ان سے کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ ہتھیار خریدنے کے فرضی قصے انگریز کے خلاف معرکہ آرائیوں کی جھوٹی کہانیاں، خوب نمک مرچ لگا کر ہندوستانی عقیدت مندوں سے بیان کرتے اور ان سے خوب چندہ بٹورتے۔

تیسری شق یعنی اپنی جماعت کے افراد کو ہی صالح سمجھنا اور دوسرے سب مسلمانوں کو فاسق یا گمراہ خیال کرنا بھی درحقیقت اس جماعتی اتحاد کو قایم رکھنے کے لئے ہے۔ ان لوگوں کو ہر جمعہ کے خطبہ میں جماعت میں شمولیت کے متعلق احادیث سنا سنا کر یقین دلایا جاتا تھا کہ جو لوگ داخل جماعت نہیں وہ ضرور ناقص الایمان ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہ تینوں امور ہر جماعت کا اتحاد اور نظم قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں یہاں تک کہ موجودہ زمانہ کی کمیونسٹ پارٹی بھی انہی اصولوں کو مشعل راہ بنائے ہوئے ہے، لیکن جس طرح ان اصولوں پر ان جماعتوں میں عمل ہو رہا ہے اس سے نہ صرف حریت فکر حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہے بلکہ انفرادی عمل کی جگہ تقلید جامد جماعتی ارکان کے دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہم نے پچھلی جنگ عظیم کے موقعہ پر کمیونسٹوں کی حریت فکر اور آزادی رائے کا ایک طرفہ تماشا دیکھا۔ جنگ عظیم چھڑنے سے پہلے تمام کمیونسٹ لیڈر بیک زبان جرمن کو پانی پی پی کر کوستے تھے اور ان کی نظروں میں ہٹلر شیطان مجسم تھا۔ کوئی برائی ایسی نہ تھی جو اس میں نہ پائی جاتی ہو۔

لیکن جونہی اس کا اسٹالن سے معاہدہ ہو گیا اور وہ جنگ عظیم میں کود پڑا تو نہ صرف اسٹالن کے اس فعل کو تدبر اور دور اندیشی سے تعبیر کیا گیا بلکہ ہٹلر کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے گئے اور جرمن کے دشمنوں کو بورجوا، دشمن انسانیت، حریت کش وغیرہ کے الفاظ سے یاد کیا گیا لیکن جونہی جرمن اور اسٹالن میں ٹھن گئی تو اب وہی اتحادی امن اور انسانیت کے دوست بن گئے اور اسٹالن تو جس طرح پہلے کمیونسٹوں کا ہیرو تھا ویسے ہی اس غداری اور وعدہ خلافی کے بعد بھی وہ ہیرو ہی رہا بلکہ اسکی غداری اور وعدہ خلافی کو اسکے انتہائی تدبر کی شان قرار دیا گیا۔ غرض ہر بات میں کمیونسٹ پارٹیاں اسٹالن کو گراموفون کا کام دیتی رہیں اور اب تک دے رہی ہیں۔ رازداری کو کمیونسٹ روس نے تو اس انتہا کو پہنچا دیا ہے کہ بائیس کروڑ نفوس ایک حاکم جماعت کے قیدی ہیں۔ نہ وہ باہر جا سکتے ہیں نہ کسی باہر کے آدمی سے مل سکتے ہیں۔ نہ ان کی مجال ہے کہ اسٹالن کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکیں کیونکہ اسٹالن کے خلاف ایک لفظ نکالنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ایک آہنی حصار ہے جو روس کو گھیرے ہوئے ہے جس کے اندر نہ تو باہر کی کوئی آواز سرایت کر سکتی ہے نہ کوئی وہاں کی آواز باہر آ سکتی ہے۔ یہاں تک کہ غیر ملکی سفرا بھی وہاں قیدیوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جماعتی عصبیت کا یہ حال ہے کہ سوائے بولشویکوں کے۔ اور سب لوگوں کو بورجوا، مادہ پرست، اخلاق باختہ، بے ایمان، جھوٹے، انسان کا گوشت پوست کھانے والے کہا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک جلسے میں ایک بہت بڑے کمیونسٹ لیڈر نے امریکہ کے متعلق بعض اعداد و شمار پیش کئے اور اس سے سرمایہ داری نظام کی خرابیوں کے متعلق استدلال کیا۔ میں خود سرمایہ داری نظام کا یا امریکہ کا دلدادہ نہیں ہوں۔ لیکن اس کی غلط بیانی ایسی صاف تھی کہ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اعتراض کیا کہ آپ کے اعداد و شمار غلط ہیں اور میں نے ایک امریکن کتاب کا حوالہ دیا تو اس کے

جواب میں ہنسا اور کہنے لگا کہ وہ بور جوا بے ایمانوں کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے معاً کہا کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ بولشویکوں نے حق و صداقت کا اجارہ لے لیا ہے۔

قصہ مختصر، اِن تینوں اصولوں پر اندھا دھند عمل کرنے سے، جو خرابیاں کسی جماعتی نظام میں پیدا ہو سکتی ہیں وہ سب کی سب جماعت مجاہدین میں بدرجہ اتم موجود تھیں اور ابتدا میں جو جوشِ عمل اور ولولۂ جہاد اِن کو دوسروں سے ممیز کرتا تھا۔ وہ مرورِ ایام سے اور بدعمل لیڈروں کی سیاہ کاریوں سے بالکل سرد ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ تقلیدِ جامد، غلط توکل اور بیکار دینداری نے لے لی تھی۔

جماعتِ مجاہدین میں گو میرا قیام کچھ زیادہ طویل نہ تھا مگر اس مختصر سے قیام میں مجھے بہت قیمتی معلومات نہ صرف اس جماعت کے متعلق حاصل ہوئیں بلکہ انقلابی جماعتوں کے طریق کار کے متعلق ایک نئی بصیرت حاصل ہوئی۔ سب سے پہلے تو یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جماعت مجاہدین کی تاسیس ایسے مبارک ہاتھوں سے ہوئی جن کے پیشِ نظر اسلام کے احیاء کے سوا اور کوئی دنیوی مقصد نہ تھا۔ ہنٹر اور دوسرے متعصب انگریز مورخوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت سید احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تحریک محض سکھوں کی بیخ کنی کے لئے اٹھی تھی، لیکن یہ بالکل غلط اور خلاف واقع ہے اور اس غرض کے لئے انھوں نے حضرت سید صاحب کی تحریرات کو مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ جماعتِ مجاہدین کے مرکز میں ایک بہت قیمتی مسودہ تھا جو حضرت شاہ اسمٰعیل صاحب کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ یہ اِن تمام خطوط کی نقول پر مشتمل تھا جو حضرت سید احمد صاحب شہید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وقتاً فوقتاً شاہانِ اسلام کو لکھے تھے۔ جن میں انھیں اپنی تحریک انقلاب میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اِن تحریروں میں

حضرت سید صاحب نے اپنی تحریک کی غرض وغایت اور اسلام کے دشمنوں کی دسیسہ کاریوں پر روشنی ڈالی تھی اور قیام دین کے مقدس فریضہ کی طرف انھیں بلایا تھا۔ وہ تمام تحریرات اس قابل ہیں کہ انھیں بجنسہ شائع کر دیا جائے اور میں نے امیر نعمت اللہ صاحب سے بہت کہا کہ وہ اس مسودہ کو میرے حوالے کر دیں۔ تاکہ میں انھیں شائع کروا سکوں، مگر انھوں نے یہی کہا کہ یہ جماعت کا متبرک ورثہ ہے اسے میں جدا نہیں کر سکتا اور دوسرے انگریز انھیں دیکھ کر فی الفور ضبط کرے گا اور تلف کرا دے گا کیونکہ ان سے اس کے اکاذیب واباطیل کا تار و پود بکھرتا تھا۔ میں نے ان تحریروں کو بار بار پڑھا کیونکہ بمصداق۔

ہو المسک ما کررتہ یتضوع

(وہ مشک کی طرح ہے کہ جتنا اسے سونگھو اتنا ہی زیادہ خوشبو دیتی ہے)

اس لئے جہاں تک میرا حافظہ میری یاوری کرتا ہے میں ان کا خلاصہ بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ ایک طرف ان بدبخت انگریز مصنفین کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا دوسری طرف مولوی عبید اللہ سندھی مرحوم[1] کے غلط پروپیگنڈا کی حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی۔

حضرت سید صاحب نے ان تحریروں میں سب سے پہلے تو اس وقت کی اسلامی سلطنتوں کے انحطاط کی تصویر کھینچی ہے اور لکھا ہے کہ اگر یہی حالت چندے رہی تو یہ

---

[1] مولانا عبید اللہ سندھی نے "شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار" میں حضرت سید احمد صاحب شہید اور ان کی تحریک کے متعلق بہت سی بے سروپا باتیں لکھ دی ہیں جن کی اشاعت ایسے عالم دین کے قلم سے نہایت افسوسناک ہے۔ دراصل مولانا سندھی کے یہ افکار بھی انگریزی زہریلے پروپیگنڈا کا نتیجہ ہیں۔ اس کتاب کی تردید مولوی مسعود عالم ندوی نے کی ہے۔

رہی سہی اسلامی حکومتیں بھی حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گی۔ انھوں نے ان کے اس تنزل و انحطاط کی اصل علت اسلام کے زرّیں اصولوں سے انحراف کو قرار دیا ہے اور ان کے اخلاقی تسفل کو اس کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے مسلمان بادشاہوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کی ہے کہ اسلام دشمنوں کی دسیسہ کاریوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ ان مکتوبات سے انھوں نے اس امر کی بار بار وضاحت کی ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلام کا سب سے زیادہ مکار اور خوفناک دشمن انگریز ہے جو ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو مٹا کر وہاں خالص کفر کی حکومت قائم کرنی چاہتا ہے۔ اس لئے وہ لکھتے ہیں کہ خدا نے اپنے ایک مومن بندے (سید احمد) کے قلب میں یہ القا کیا ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا وقت آن پہنچا ہے اور اس کی ابتدا اقامت دین کے مقدس فریضہ سے ہونی چاہیے۔ اقامت دین کا مطلب یہ ہے کہ خود مسلمانوں کو اسلامی شعار اور تعلیمات کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ کذب اور جھوٹ، رشوت ستانی، خویش پروری، اقربا نوازی، ملت فروشی، غداری کے مہلک امراض سے نجات پا کر نئے سرے سے متحد ہو کر انگریزوں کو ہندستان سے نکال کر وہاں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم کریں اور فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ کر ہندوستان کو تمام دنیا میں اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ایک مرکزی اور قابلِ تقلید (نقطۂ ماسکہ) فوکس (Focus) بنائیں تاکہ اسلام کی شعائیں وہاں سے نکل نکل کر تمام دنیا کو منور کریں اور دنیا میں اسلام کا بول بالا ہو کر امن، اخوت، مساوات، اور جمہوریت کا دَور دَورہ ہو۔

انگریز کے اثر و نفوذ کے متعلق حضرت سید صاحب نے نہایت بصیرت افروز مقالات تحریر کئے ہیں۔ وہ انھیں اسلام کا سخت ترین دشمن قرار دیتے ہیں اور

لکھتے ہیں کہ انگریز کی ریشہ دوانیوں نے تمام اسلامی ممالک کو اغیار کا غلام بنا دیا ہے اس لیئے ہر انقلابی مسلمان کا فرض ہے کہ وہ انگریز کے خلاف برسرِ پیکار رہو اور اس کی ابتدا ہندوستان سے انگریز کو خارج کرنے اور ہند میں اسلامی سلطنت قائم کرنے سے ہونی چاہیئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگر انگریز کو ہندوستان سے نکال دیا جائے تو سب اسلامی ممالک کی آزادی کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ انگریزی حکومت کا تختہ پلٹنے کے بعد حضرت سید احمد صاحب نے اسلام کے احیا اور نشر داشاعت کا ایک مفصل پروگرام پیش کیا جس کا نچوڑ یہ تھا کہ مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنایا جائے اور انھیں خود غرض، طامع، لالچی، بے ایمان رہنماؤں اور بادشاہوں کے پنجے سے نجات دلائی جائے تاکہ وہ دنیا کو اسلام کی برکتوں سے متمتع کر سکیں۔

سید صاحب نے ہر بدعت اور بد اخلاقی کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ مسلمانوں کے مزمن، فرقہ پرستی کے خلاف انھوں نے علم بغاوت بلند کیا اور تمام مختلف فرقوں کو دعوت دی کہ:۔

ما انا علیہ واصحابی "جس پر میں اور میرے رفقا گامزن ہیں" سے تمسک کریں[1]۔ انھوں نے حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی فرقوں میں اعتدال کی راہ تجویز کی کہ جس امام کا مسلک کسی خاص مسئلے میں کتاب وسنت کے قریب تر ہو اسی کو اختیار کر لیا جائے۔ چنانچہ باوجودیکہ وہ حنفی تھے لیکن بہت سے مسائل میں حنفی مسلک سے

---

[1] ۔ اس میں ایک طویل حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں مختلف فرقے ہو جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ایسے وقت میں ہم کیا کریں۔ فرمایا کہ اس راستہ پر چلو جس پر میں اور میرے رفقا گامزن ہیں۔

انحراف کر کے سنت کے مطابق یا کسی دوسرے مجتہد کے اجتہاد کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور اس مسلک کو انھوں نے مسلک احمدیت کے نام سے موسوم فرمایا۔ مثلاً رفع یدین اور آمین بالجہر کے متعلق حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور فتویٰ حضرت سید صاحب کے مسلک اعتدال کا آئینہ دار ہے۔

لیکن حضرت سید احمد صاحب کے مکاتیب کا وہ حصہ جس میں وہ برٹش امپیریلزم کو بے نقاب کرتے ہیں اہم ترین ہے، اور اسے دیکھ کر ان کی زبردست سیاسی بصیرت اور علم تاریخ سے آگاہی کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے صاف کہا کہ برٹش امپیریلزم کا مقصد اسلام کو تباہ کرنا اور صلیبی لڑائیوں کی شکست کا بدلہ لینا ہے اور اس غرض کے لئے وہ آہستہ آہستہ تمام اسلامی ممالک کو ہضم کرتا جائے گا۔ وہ برٹش امپیریلزم کو فرانس، جرمنی اور روس سب سے زیادہ خوفناک دشمن خیال کرتے تھے۔ انھوں نے جو کچھ اپنے مکاتیب میں تحریر فرمایا اور برٹش امپیریلزم کے عزائم کے متعلق جو کچھ لکھا وہ ان کی شہادت کے بعد حرفاً حرفاً پورا ہوا اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مشرق میں سلطان ٹیپو شہید کے بعد برٹش امپیریلزم کا حضرت سید احمد صاحب سے بڑا دشمن پیدا ہی نہیں ہوا۔ اسی لئے برٹش گورنمنٹ نے بھی اپنے اس دشمن کے خلاف ہر قسم کے حربے استعمال کیے۔ اجیر مولویوں کو رکھ کر جھوٹا پروپیگنڈا کروانا، جاسوسی کے ذریعے ان کے آدمیوں کو قتل کروانا، امیر افغانستان کو رشوت دیکر حضرت سید صاحب کے خلاف غدر پر آمادہ کرنا، سکھوں کو ان کے خلاف ہر قسم کی کمک دے کر تیار کرنا ان کے پرفریب پروگرام کا ادنیٰ کرشمہ تھے۔ ان کی تفصیل کے لئے کسی بڑے مورخ کا قلم درکار ہے۔ قصہ مختصر، حضرت سید احمد صاحب کی بے وقت شہادت نے ان کی ساری اسکیم کو بے کار کر دیا۔ ان کے جانشینوں نے ایک مدت تک ان کے مشن کو چلایا اور ہندوستان اور بیرون ہند میں انگریزی

استعمار کے خلاف نہایت منظم کام کیا، مگر کچھ عرصے کے بعد ان کے ایسے جانشین آگئے جنہوں نے دنیاوی منفعت کو دینی خدمت پر ترجیح دی اور جب میں پہنچا تو اس جماعت کی عنانِ اقتدار امیر نعمت اللہ کے ہاتھوں میں تھی۔

امیر نعمت اللہ مرحوم ایک بھاری بھرکم خوبصورت وجیہ دراز قامت نوجوان تھے۔ گفتگو میں نہایت شائستہ متین اور سنجیدہ تھے۔ بڑے زیرک اور مردم شناس آدمی تھے۔ ان کے خطبات کافی دلنشین ہوتے تھے۔ خوبصورت ترشی ہوئی ڈاڑھی، سر پر خوبصورت ستھرے پٹے رکھتے تھے۔ لباس میں پٹنہ اور یوپی کا قدیم غرارہ اور لمبا کرتہ، تکمہ دار صدری پہنتے تھے۔ سر پر عمامہ اور ہاتھ میں نفیس چھڑی، مسلمان امراء و مشائخ کی طرح عورتوں کے بے حد شوقین تھے۔ تین تو ان کی نکاحتا بیویاں تھیں اور دس بارہ نہایت خوبصورت لڑکیاں بطور خادماؤں کے رکھتے تھے۔ امیر حبیب اللہ خاں کی طرح امیر نعمت اللہ کا بھی زیادہ وقت انہی نوجوان لڑکیوں سے لہو و لعب میں گزرتا تھا۔ جماعتِ مجاہدین میں یہ قاعدہ تھا کہ خلفائے راشدین کی طرح امیر جماعت نماز میں امامت کے فرائض بھی ادا کرتا تھا۔ مگر امیر نعمت اللہ نے جہاد کی مصروفیتوں کا عذر کر کے ایک اور حافظ صاحب کو اپنی جگہ امام مقرر کر رکھا تھا۔ بعض اوقات امیر صاحب اذان کے بعد فوراً تشریف لے آتے تو وہ امامت کے فرائض انجام دیتے ورنہ بالعموم وہی حافظ صاحب امامت کرواتے اور امیر صاحب کبھی کبھار مسجد میں تشریف لاکر شریک جماعت ہو جاتے اور ایک بندوق بردار پہرہ دار سنگین چڑھائے ہوئے ان کے پیچھے حفاظت کے لئے کھڑا رہتا تھا۔ جب نماز ختم ہو چکتی تو امیر صاحب واپس تشریف لے جاتے اور پہرہ دار انہیں زنانخانہ میں پہنچا کر واپس آکر نماز ادا کرتا۔

جماعت مجاہدین کی قیام گاہ ایک کچے قلعہ کی صورت میں تھی۔ ایک مربع

دیوار قلعہ کی فصیل کی طرح اس تمام بستی کے اردگرد بنی ہوئی تھی۔ اس میں چار دل کونوں پر دمدمے بنے ہوئے تھے۔ جن میں بندوق بردار بوقت ضرورت بیٹھ کر بستی کی حفاظت کر سکتے تھے۔ بستی کا ایک بڑا دروازہ تھا جو رات کو بند کر دیا جاتا تھا۔ اور اس پر رات کو بندوق کا پہرہ رہتا تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی دائیں جانب مکانات تھے۔ بیچ میں اچھا خاصہ صحن تھا اور صحن کی دوسری طرف دروازے کے بالمقابل امیر المجاہدین کی اقامت گاہ تھی۔ اس عمارت میں مجاہدین کا بیت المال تھا جس کی کنجی امیر صاحب کے پاس رہتی تھی۔ کسی شخص کو بیت المال کے متعلق امیر صاحب سے سوال کرنے کا حق نہ تھا۔ میں نے سنا کہ بعض گستاخوں نے بیت المال کے متعلق سوال کرنے کی جسارت کی مگر اس کا جواب یہ ملتا کہ رات کو چپکے سے امیر صاحب کے معتمد انہیں ختم کر دیتے تھے اور پھر اس کا ذکر بھی کوئی شخص نہ کر سکتا تھا۔ امیر صاحب کے دولت کدہ کے اردگرد مجاہدین کے مکانات تھے۔ شادی شدہ لوگوں کے کوارٹرز تھے اور غیر شادی شدہ لوگوں کے لئے بیرکیں تھیں۔ امیر صاحب کے اردگرد ان کے خاص الخاص معتمدین کے مکانات تھے۔ دروازے کے متصل دو منزلہ مکانات بھی تھے جن میں امیر صاحب کے بھائی امیر رحمت اللہ اور ان کے حواری فروکش تھے۔

جماعت کا ایک مرکزی لنگر تھا جس میں نہایت ردّی خوراک روزانہ دونوں وقت مجاہدین میں تقسیم ہوتی تھی۔ خوراک میں عام طور پر مکّی کا آٹا، بیماروں کے لئے گیہوں کا آٹا۔ مسور کی دال جسے تیل سے بگھارا جاتا تھا۔ عیال دار اور مجرد دونوں وقت اپنے اپنے برتن لے کر۔ لنگر خانے میں پہنچ جاتے اور اپنے حصے کا کھانا لے کر آجاتے تھے۔ ان میں اکثر لوگوں کی قناعت حیرت انگیز تھی کہ کیونکہ اس درجہ ردی غذا پر صبر و شکر سے قناعت کئے بیٹھے رہتے تھے۔ غذا کی خرابی کی وجہ سے اکثر مجاہدین تپ کہنہ کا شکار، مشت استخواں، نہایت دبلے اور منحنی لوگ تھے۔

بعض لوگ علاحدہ اپنا کام کرتے تھے اور وہ اپنے کھانے وغیرہ کا الگ انتظام کرتے تھے لیکن ان لوگوں کے علاوہ ایک خاص حلقہ ان لوگوں کا تھا جو امیر صاحب کے حوالی موالی تھے۔ انھیں اپنی خدمات کے صلے میں امیر صاحب ہمیشہ داد و دہش سے نوازتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ تو امیر صاحب کے جاں نثار خدام میں سے تھے جو امیر صاحب کے ادنیٰ اشارے پر ہر قسم کے جرائم کرنے پر آمادہ و تیار رہتے تھے۔ مثلاً اگر امیر صاحب کی خادماؤں میں سے کوئی لڑکی حاملہ ہو جائے تو اس کے بچے کو پیدائش کے بعد گلا گھونٹ کے چپکے سے دریا برد کر دینا۔ امیر صاحب کی عادت تھی کہ ان خادماؤں کو اکثر بدلتے رہتے تھے۔ جو خادمائیں اس طرح الگ کی جاتی تھیں اُن کی شادیاں انہی لوگوں میں سے کسی ایک سے کر دی جاتی تھی اور اُسے نہایت عمدہ جہیز اور ماہوار خرچ مل جاتا تھا اور یہ امر اس درجہ افسوس ناک تھا کہ ان میں سے جو لڑکی غیر معمولی طور پر خوبصورت ہوتی وہ شادی کے بعد بھی امیر صاحب کی توجہات کا مرکز بنی رہتی تھی۔

امیر نعمت اللہ کے بعد ان کے برادر امیر رحمت اللہ جماعت میں صاحب اثر و رسوخ تھے، مگر چوں کہ بیت المال امیر نعمت اللہ کے قبضہ میں تھا اس لئے ہر شخص امیر صاحب کی نظرِ عنایت کا محتاج تھا ورنہ فاقہ کشی سے اس کا خاتمہ یقینی تھا۔ امیر نعمت اللہ نے اس قدر ہوشیاری سے اپنا جال بچھا رکھا تھا کہ کوئی شخص اِن کے سامنے دم نہ مار سکتا تھا۔ رحمت اللہ بھی اپنے بھائی کی طرح بہت بد چلن اور آوارہ مزاج نوجوان تھے۔ اگر امیر نعمت اللہ کو لڑکیوں کی رغبت نے معطل کر رکھا تھا، تو انھیں نوجوان لڑکوں کی محبّت نے دنیا و مافیہا سے بے خبر بنا رکھا تھا۔ کبھی کبھار انھیں روپیہ کی ضرورت ہوتی اور امیر نعمت اللہ کہیں انکار کر دیتے تو بس جماعت کے احاطہ میں ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ رحمت اپنے بڑے بھائی کو خوب مغلظات سناتے اور روپیہ لے کر ہی ٹلتے۔ ہم لوگ اِن لڑائیوں سے تنگ آچکے تھے، مگر

کیا کرتے ہیں نے کئی دفعہ امیر صاحب سے کہا کہ رحمت اللہ کا خاص وظیفہ مقرر کر دیجئے مگر وہ کہتے کہ رحمت اللہ او باش ہے کوئی وظیفہ اس کی روز افزوں ضروریات کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم' یہ محض بہانہ تھا یا اس میں واقعیت کا بھی کچھ شائبہ تھا۔

امیر نعمت اللہ کی اولاد نرینہ میں سے سب سے بڑا لڑکا برکت اللہ تھا۔ جو غالباً اس وقت نو سال کا تھا۔ لڑکا خاصا خوب صورت اور بگڑا ہوا صاحب زادہ تھا۔ ہر وقت دو تین اوباش نوجوان اس کی مصاحبت میں رہتے' اس لئے اس کا آوارہ ہونا لابدی تھا۔ میں نے بسا اوقات اس کے والد پر زور دیا کہ برکت اللہ کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیں کیونکہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے مسلمان امرا کے بچے زیور تعلیم سے آراستہ ہوں۔ قیصر ولیم کے شہزادوں کے واقعات اور پرنس آف ویلز (سابق کنگ ایڈورڈ ہشتم) کے واقعات سُنا سُنا کر انھیں غیرت دلاتا کہ کفار امرا کے بیٹے تو ایسے ماحول میں پرورش پائیں اور ہمارے امرا کے چشم و چراغ کی اٹھان ایسی بُری ہو' مگر امیر صاحب پر کچھ اس کا اثر نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔

جماعت کے باثر حضرات میں سے امیر نعمت اللہ کے بعد ملا بشیر (مولوی عبدالرحیم) تھے۔ ان کا ذکر میں تفصیل سے کر آیا ہوں۔ ملا بشیر واقعی حیرت انگیز شخص تھے۔ سلف صالح کے سچے جانشین' ان تھک کارکن' مجسم عمل' ایثار کا پیکر' بے غرض' صحیح معنوں میں انقلابی لیڈر تھے۔ انھیں دیکھ کر اقبال کا مشہور شعر یاد آتا تھا۔

یہ کلی بھی اِس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

امیر حبیب اللہ خاں صاحب نے ان کے کام سے خوش ہو کر ان کا

ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ وہ اس میں قوتِ لایموت رکھ لیتے (غالباً پانچ روپیہ ماہوار) اور باقی سب بیت المال میں اسلحہ کے لئے جمع کرا دیتے تھے۔ ان کا اثر تمام یاغستان میں بے نظیر تھا۔ ہر قبیلہ کے ملک اور شیوخ ان کی بے حد عزت کرتے تھے اور حق تو یہ ہے کہ ان کی وجہ سے امیر نعمت اللہ کا تمام علاقے میں خاصا وقار قائم ہو گیا تھا۔

جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں جوں جوں ہمارا کام قبائلی علاقہ میں ترقی کر رہا تھا۔ ہندوستان میں گورنمنٹ انگریزی کی دار و گیر ہمارے کارکنوں کے خلاف زیادہ سخت ہوتی جا رہی تھی۔ چناں چہ اس کا سب سے پہلا وار مولوی ولی محمد صاحب پر ہوا۔ والد صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کو اس کا علم ہو گیا۔ انھوں نے مولوی صاحب کو بروقت متنبہ کر دیا۔ اس پر مولوی صاحب نے ایک سو پنجابی مجاہدین سمیت ہجرت کی اور اسمست چلے گئے۔ ہمیں ان کے آجانے سے بہت مسرت ہوئی کہ ایک عمدہ رفیق کار آگیا اور ان کے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے جماعت کی اصلاح میں کوشش کریں گے۔ اسمست میں امیر نعمت اللہ نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور ان سے بیعت لے کر جماعت میں داخل کر لیا۔ بدقسمتی سے اسمست میں آکر پنجابی اور بنگالی کا سوال پیدا ہو گیا۔ بنگالیوں میں حد درجہ کی صوبائی عصبیت ہے۔ اس کی بنا پر انھوں نے پنجابیوں کے خلاف ایجی ٹیشن کرنا شروع کر دیا۔ ہم نے اس نازک صورت حالات کی بنا پر امیر نعمت اللہ سے منظوری لی کہ یہ پنجابی جماعت چمرکنڈ میں مقیم ہو جائے۔ چنانچہ میں چمرکنڈ میں ہی اِس جماعت کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ یہ پنجابی جماعت حقیقی معنوں میں مجاہد اور انقلاب کے لئے بے تاب تھی۔ مولوی ولی محمد صاحب نے جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں اپنا نام محمد موسیٰ رکھا اور آیندہ ہم انھیں محمد موسیٰ کے نام سے ہی یاد کریں گے۔ امیر نعمت اللہ نے مولوی محمد موسیٰ کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے پہلے

ان کی شادی ایک خوبصورت لڑکی سے کر دی۔ اس کے چند ماہ بعد ایک دوسری خوبصورت لڑکی سے ان کی شادی کر دی۔ اب ان کی دو بیویاں ہو گئیں۔ جب میں پہنچا تو ان کی چھوٹی بیوی کے ہاں ایک لڑکا بھی تولد ہو چکا تھا اور مولوی صاحب اب پورے متاہل ہو گئے تھے۔ امیر نعمت اللہ نے ان کے لئے خاصا معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور وہ بظاہر ان کے سلوک سے بہت خوش تھے۔ یوں بھی امیر نعمت اللہ ان کی بے انتہا عزت کرتے تھے اور اپنے تمام مشوروں میں انھیں شریک کرتے تھے۔ جب مولوی محمد موسیٰ صاحب اسمست پہنچے تو میں چمرکنڈ میں تھا۔ مجھے ان کی آمد سے بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ مجھے خیال تھا کہ ان کا قیام جماعتِ مجاہدین کی اصلاح میں مدد دے گا۔ مجھے یقین تھا کہ جس شخص نے پنجاب میں ایک آگ سی لگا دی تھی اور گاؤں گاؤں میں انگریز کی مخالفت کا بیج بویا تھا وہ بالضرور جماعتِ مجاہدین کی کایا پلٹنے میں کامیاب ہو گا۔ چنانچہ میرے اسمست جانے کے کئی محرکات میں سے ایک بہت بڑا محرک ان سے ملاقات بھی تھا کہ ان سے تبادلۂ خیالات کر کے اپنے دیرینہ پروگرام کی تکمیل میں اُن سے مدد لوں گا۔ چنانچہ اسمست پہنچ کر اوّلین فرصت میں میں نے انھیں اپنے گھر بلایا۔ ملا البشیر صاحب موجود تھے اور ہم تینوں کی بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ مولوی صاحب نے سب سے پہلے تو امیر نعمت اللہ کے خلاف شکایت کا ایک طومار بیان کیا۔ ان کی بدحنوانیاں، ان کا عورتوں کے ساتھ شغف، ان کی جہاد سے غفلت و اعراض۔ جماعتی فنڈ کو اپنے اغراض مشؤمہ کی تکمیل کے لئے بے دریغ استعمال کرنا سب بیش کیے اور کہا کہ مجھے تو شرم آتی ہے کہ میں پنجاب میں اس شخص کے متعلق اتنا جھوٹا پروپیگنڈا کرتا رہا اور لوگوں کو جماعت کے فرضی کارناموں کی داستانوں سے اپنی طرف مائل کرتا رہا۔ یہاں آ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں پنجاب میں حالتِ خواب

میں تھا اور اب آنکھیں کھلی ہیں تو ایک بھیانک منظر سامنے ہے۔ جماعتِ مجاہدین اخلاقی طور پر مر چکی ہے۔ اس کی عملی قوتیں فنا ہو چکی ہیں۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک، تو خوش حال طبقہ جو امیر مجاہدین کے متوسلین پر مشتمل ہے۔ وہ لوگ نہایت سخت اوباش، بدچلن اور خود غرض ہیں۔ انھیں تو صرف اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ دوسرا طبقہ عام لوگوں کا ہے جو بالکل جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھیں قوت لایموت بھی مشکل سے میسر آتا ہے۔ تیل کی بگھاری ہوئی مسور کی دال اور مکا یا جوار کی روٹی ان کی غذا ہے۔ ان لوگوں کو مذہب کی افیون پلا کر خواب خرگوش میں مبتلا کر دیا گیا ہے اور وہ اپنی اس زندگی پر بھی بے انتہا شاداں ہیں ان کو یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت سید احمد صاحب شہید نہیں ہوئے بلکہ عین لڑائی کے دوران میں ان کا رفع الی السماء ہوا اور اب وہ واپس تشریف لانے والے ہیں۔ یہی مجاہدین ان کے اصحاب صفہ بنیں گے اور وہ پھر ہندوستان کو فتح کریں گے۔ مولوی صاحب نے صاف کہا کہ میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں ہندوستان ہی میں مارا جاتا اور یہاں نہ آتا کیونکہ یہاں آکر میرا اپنا ایمان متزلزل ہو رہا ہے کہ کیا مذہب اسی کا نام ہے۔ میں تو یہاں آکر پچھتا رہا ہوں۔ امیر المجاہدین نے کمال ہوشیاری سے میری دو شادیاں کر دی ہیں دونوں خوبصورت اور جوان ہیں اور ہر طرح سے نہایت اچھی بیویاں ہیں اور اب مجھے اس دنیاوی زندگی سے ان کی بدولت اتنی دلبستگی ہو گئی ہے کہ امیر المجاہدین کے خلاف لب نہیں ہلا سکتا کیونکہ یہ شخص ایسا ہے اصول ہے کہ جو شخص ذرا بھی بغاوت کا میلان ظاہر کرتا ہے اُسے فی الفور قتل کروا دیتا ہے اور مجھے یہ رنج ہوتا ہے کہ میں اگر اس طرح قتل ہو جاؤں گا تو میری بیوی بچے کیا کریں گے اور شیخ سعدی کا یہ شعر پڑھا۔

اگر دنیا نباشد دردمندیم　　　وگر باشد بہ مہرش پائے بندیم

مجھے انہوں نے بہت زور سے کہا کہ میں کسی اصلاح کا خیال بھی ظاہر نہ کروں ورنہ امیر المجاہدین مجھے بلا تامل قتل کروا دیں گے۔ میں نے ان کے سامنے امیر حبیب اللہ کی غداری کی داستان دُہرائی اور کہا کہ ہماری تمام اسکیم کامیاب ہوتے ہوئے محض امیر حبیب اللہ خاں کی بزدلی اور عیش دوستی کی وجہ سے ناکام ہو رہی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس کے لئے کوئی نیا سربراہ تلاش کیا جائے جس پر تمام قبائلیوں کا اتفاق ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ امیر المجاہدین سے اس امر کی توقع فضول ہے۔ قصہ مختصر، وہ بہت مایوس تھے۔ انھوں نے صاف کہا کہ انقلاب کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ امیر حبیب اللہ خاں اور امیر نعمت اللہ دونوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی جگہ ایک پرزور لیڈرشپ قائم کی جائے۔ مگر انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں خود کسی ایسی تحریک میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں مگر ہم پر بھی ایسا نشہ مسلط نہ تھا جسے مولوی محمد موسیٰ صاحب کی ترشی اتار سکتی۔

امیر المجاہدین کے ایک میر منشی تھے جو ہمارے قصور کے بہت بڑے رئیس تھے۔ ان کا اصل نام تو مولوی ولی اللہ تھا مگر اختیاری نام مولوی عبدالواسع تھا۔ مولوی عبدالواسع قصور کے ایک معمولی آدمی تھے۔ مگر اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت ریاست فریدکوٹ میں میر منشی ہو گئے اور دولت مند بن گئے۔ جب راجہ فوت ہو گیا اور اس کا نابالغ بیٹا گدی پر بیٹھا تو سرکار انگلشیہ نے ایک کونسل آف ریجنسی مقرر کی جس میں وہ بہ حیثیت ایک رکن کے مقرر ہوئے اور ان کا منصب وزیر مقرر ہوا۔ راجہ کے سن بلوغ تک تو انھوں نے خوب دبدبہ سے حکومت کی۔ لیکن راجہ کے عنانِ اقتدار سنبھالتے ہی ان کے اقبال کا ستارہ غروب ہونا شروع ہوا۔ راجہ نے گدی سنبھالتے ہی سب سے پہلے کونسل آف ریجنسی کے ممبروں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ مولوی عبدالواسع صاحب بھی مقدمے میں دھرے گئے

اور جس طرح ریاستوں میں اندھیر گردی ہوتی تھی وہ ایک ہی دن میں چار سال کے لئے قید کر دیئے گئے۔ والد صاحب قبلہ مرحوم و مغفور نے بمشکل تمام انھیں ضمانت پر رہا کر دیا اور وہ راتوں رات ریاست سے مفرور ہو کر حضرت والد صاحب کی وساطت سے اسمست پہنچا دیئے گئے۔ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے اور فارسی پر ایسی قدرت تھی کہ ان کے مکتوبات ابوالفضل کے انشا کی یاد تازہ کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب میں کابل میں تھا اور ان کے مراسلے امیر حبیب اللہ کی خدمت میں پہنچتے تھے تو وہ انھیں مکرر سہ کرر پڑھا کرتے تھے اور مولوی صاحب کی اعلا فارسی انشاء کی داد دیتے اور ان کی خوش خطی کی تعریف کرتے۔ کابل میں اس زمانہ میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو فارسی میں ان کی ہمسری کر سکتا۔ وہ ایک بوڑھے پرانے خیال کے بزرگ تھے۔ ہر قسم کی سیاسی اور انقلابی کاموں سے الگ تھلگ رہ کر امیر نعمت اللہ کی حاشیہ برداری میں اپنی عمر کے بقیہ دن گزار دینا چاہتے تھے۔ میرے ان کے چونکہ قدیمی مراسم تھے اور میرا بچپن ایک طرح سے ان کی گود میں بسر ہوا تھا۔ اس لئے وہ مجھ سے بے انتہا محبّت فرماتے تھے اور کبھی کبھی علاحدگی میں مجھے نصیحت کیا کرتے کہ تمام انقلابی خیالات سے تائب ہو کر امیر نعمت اللہ کے مصاحب کے طور پر آرام سے اپنی زندگی بسر کروں۔ بالجملہ وہ بہت ہی مرنجان مرنج اور صلح کل شخص تھے۔ امیر المجاہدین ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ہر طرح سے ان کے آرام اور آسایش کا خیال رکھتے تھے۔ ایک نوکر کھانا پکانے کے لئے اور تمام رسد اور جیب خرچ ان کو ملتا تھا اور وہ بہت خوش رہتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی ریاست اور وزارت کو یاد کر کے آب دیدہ ہو جاتے مگر بالعموم وہ راضی برضا رہتے تھے۔ اور امیر صاحب کی تعریف میں رطب اللسان۔

جماعت مجاہدین کی مثال اب ایک گلستانِ خزاں منظر کی تھی۔ وہ اخلاقی لحاظ سے مردہ ہو چکی تھی اور اس کی انقلابی روح بالکل سرد ہو چکی تھی، یا اس کی مثال ایسے جسدِ بے جان کی سی تھی جو طرح طرح کی ملمع کاریوں کی وجہ سے دور سے جاندار معلوم دیتا ہوئے دیکھ کر کبھی یہ یقین نہ ہوتا تھا کہ یہ وہ جماعت ہے جس کے اسلاف کے خون سے بالاکوٹ کی سرزمین لالہ زار بنی یا جس کی اقامت دین کی انتھک مساعی سے پشاور اور ہزارہ کے اضلاع کے جمود میں حرکت پیدا ہوئی۔ اللہ اکبر! جس جماعت کے اسلاف نے ہندستان میں اسلامی قربانی و ایثار کی ایسی شاندار مثالیں پیش کی تھیں، جن پر انسانیت اور حریت ابدالآباد تک فخر کریں گی، اس کی اب یہ حالت تھی کہ ان کی عظمتِ گزشتہ کا نشان تک بھی اس میں باقی نہ تھا۔ اس جماعت میں یہود کی طرح یا شیعہ حضرات کی طرح یہ عقیدہ پرورش پا چکا تھا۔ کہ اب ان پر جہاد فرض نہیں۔ سید احمد صاحب دوبارہ ظاہر ہو کر تلوار کو بے نیام کریں گے اور انگریز کو ہندستان سے نکال کر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم کریں گے۔

اجتماعی نفسیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب قوموں کو انتہائی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بظاہر حالات امید بالکل منقطع ہو جاتی ہے تو وہ ایک موہوم امید کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ چنانچہ یہود کا مسیح کی آمد کا منتظر رہنا اور مسیح کی آمد کے لئے دست بدعا رہنا تاریخی حقیقت ہے اسی طرح شیعہ حضرات کا صدیوں تک غار سُرّ من رائی کے دہانے پر جا کر امام غائب مہدی آخر الزماں کے ظہور کی دعائیں کرنا معلوم عوام ہے۔ اسی قبیل سے جماعت مجاہدین کو جب انتہائی ہزیمت اٹھانی پڑی اور ان کی کوئی اسکیم بظاہر کامیاب نہ ہوئی تو لوگوں میں سید احمد صاحب کے ظہورِ ثانی کا عقیدہ نشوونما پانے لگا حضرت سید احمد صاحب کی شخصیت جو براہِ راست مشکوۃ نبوت سے مستنیر تھی ایسی

حیرت انگیز تھی اور ان سے ایسے محیر العقول کارنامے سرزد ہوئے کہ عام لوگوں کے خیال میں یہ بات آہی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنے مشن میں ناکام بھی ہو سکتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت سیّد احمد صاحب اور ان کے رفقائے کرام پٹھانوں کی غدّاری سے ہری سنگھ نلوے کے ہاتھوں بالاکوٹ میں شہید ہوئے تو راسخ العقیدہ مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت سید صاحب شہید نہیں ہوئے بلکہ غائب ہو گئے ہیں۔ اور ایک مناسب و موزوں موقع پر دوبارہ تشریف لائیں گے۔ چنانچہ جماعت مجاہدین کے اکثر راسخ العقیدہ لوگوں کو یہ یقین تھا کہ حضرت سید صاحب دوبارہ تشریف لائیں گے اور اس جہان کو الحاد و زندقہ اور کفر و شیعیّت سے پاک کریں گے۔ چنانچہ مجاہدین کی جماعت میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا موجود تھا جو نہایت متدین تھے۔ اور نہایت خشوع و خضوع سے ہر وقت یہ دعا کرتے تھے کہ خدایا! ہمارا ابتلا کا دور ختم ہو اور سید صاحب دوبارہ تشریف لائیں۔ چنانچہ جب میں پہنچا تو کئی راسخ العقیدہ مسلمانوں نے مجھ سے اپنے رویا بیان کیے کہ حضرت سید صاحب ان کے خواب میں تشریف لائے ہیں اور فرما گئے ہیں کہ ہم اب ظاہر ہونے والے ہیں۔ ایسے خوابوں کی کثرت سے اشاعت کی جاتی تھی اور حکمران طبقہ کی طرف سے ان کے ذریعہ ہندستان اور یاغستان کے جہال کے حسن ظن سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی جاتی تھی۔ وہ لوگ دیانتداری سے یہ سمجھتے تھے کہ جب تک حضرت سیّد احمد صاحب تشریف نہ لائیں گے اس وقت تک جہاد کی تیاری کرنا فضول تھا حضرت سید صاحب کے ساتھ فرشتوں کا ایک جرّار لشکر ہوگا اور فتح و نصرت ان کی رکاب تھامے ہوں گی۔ میں آگے چل کر لکھوں گا کہ کیونکر میں نے اس فاسد عقیدہ کے خلاف جہاد کیا اور مسلمانوں کو واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل (القرآن)

"اور مسلمانو! (کفار کے مقابلے کے لئے) جہاں تک تم سے ہو سکے قوت پیدا کرو اور گھوڑوں کی چھاؤنیاں بناؤ" کے معنی سمجھانے کی کوشش کی۔ فی الحال جماعت کے نظم و نسق اور طریق کار پر روشنی ڈالنی چاہتا ہوں۔

گو جماعتِ مجاہدین کا مرکز مردہ ہو چکا تھا مگر اس کے پروپگینڈا کا نظام ابھی تک بہت وسیع اور عمدہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ سیدھے سادے مسلمان جنھیں کتاب و سنت کے ساتھ عشق ہوتا تھا اس پروپگینڈا کا آسانی سے شکار ہوتے تھے مسلمانوں میں اکثر لوگ حسنِ ظن کا شکار ہیں۔ یہ دنیا دار لوگ پیروں کے طلسم باطل میں گرفتار ہیں اور دیندار مجاہد قسم کے لوگ جماعتِ مجاہدین کے معتقد ہیں۔ قادیانی جماعت یا شیعہ مذہب کے فروغ کی اصل وجہ بھی مسلمانوں کا یہی اندھا عقیدہ اور حسن ظن ہے۔ شیعہ مذہب میں بالخصوص آغا خانی جماعت اس کی نہایت عمدہ مثال پیش کرتی ہے کہ اگرچہ مرکز میں اخلاقی روح باقی نہ ہو مگر پھر بھی منظم پروپگینڈا کیونکر ہزاروں خوش عقیدہ مذہبی خیال کے آدمیوں کو جماعت سے وابستہ کئے رکھتا ہے۔ خیر جماعت مجاہدین کے موسّسین نے شروع سے جماعت کے قیام و بقا کے لئے ایسا منظم سسٹم بنایا تھا کہ انگریزوں کا تشدد اور غدر کے مقدمات بھی اس نظام کو توڑ نہ سکے۔ چنانچہ ہندوستان میں جگہ جگہ مختلف ادارے تھے جو بظاہر تعلیمی مشاغل میں منہمک تھے اور مدرسوں کے اور خیراتی اداروں کے ذریعے کافی رقم جمع کرتے تھے۔ اس رقم کا ایک معتدبہ حصہ سرحد پار امیر المجاہدین کے پاس جہاد کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ ہندوستان میں مولوی ولی محمد حسن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں کہ مولوی محمد احمد میاں صاحب مرحوم مولوی فضل الٰہی صاحب مرحوم والد صاحب قبلہ پنجاب میں نہایت مستعدی سے کام کرتے تھے۔ پٹنہ اور بہار میں مولانا عبدالعزیز رحیم ترا کری، حافظ عبداللہ نزہپوری، ڈاکٹر فرید، حافظ محمد صدیق وغیرہ

رتلام اور بمبئی میں حافظ عبدالغفور، مدراس میں کاکا عمر صاحب وغیرہم، اپنے اپنے حلقوں میں بہت مفید کام کرتے تھے اور خاموشی سے مجاہدین کا پروپگنڈا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی سینکڑوں کارکن تھے جو شب و روز عبادت کی طرح جہاد کے پروپیگنڈا میں مصروف رہتے تھے دہلی میں پنجابی اہل حدیث کی جماعت، کلکتہ میں کپڑے اور لوہے کے مسلمان اہل حدیث سوداگر سب ہی اس مبارک کام میں شرکت کرتے تھے۔ مگر درحقیقت یہ سب لوگ ایک دوسرے سے کچھ زیادہ باخبر نہ تھے۔ ان کو ملانے والے وہ قاصد تھے جو اسمست سے آئے تھے اور امیر المجاہدین کے پیغامات ان تک پہنچاتے رہتے تھے۔ ان قاصدوں میں سے دو تین قاصد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عبدالقادر، عبداللہ، عبدالرحمن وغیرہم کے نام جماعت مجاہدین کی خدمت کے باعث زندہ جاوید بن چکے ہیں۔

یہ قاصد نہایت ہوشیار، زیرک اور معتمد علیہ تھے۔ ان کی رازداری دیانت وامانت اپنی آپ مثال تھی۔ وہ بہروپ بھرنے میں اُستاد، اپنا حلیہ بدلنے میں مشاق تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی۔ اور اسپیشل پولیس ہر وقت ان کے تعاقب میں رہتی تھی لیکن یہ انھیں دھوکا دیتے اور رنگروٹ اور روپیہ اور پیغامات صحیح سلامت اسمست تک پہنچانے میں شرلاک ہومز کی کہانیوں کی یاد تازہ کرتے تھے۔ بالعموم یہ لوگ ہری پور ہزارہ یا پشاور سے ہندستان میں داخل ہوتے تھے اور پنجاب، دہلی، یوپی، بہار، کلکتہ سی پی، رتلام، بمبئی، بنگلور اور مدراس کے چکر لگا کر تمام جمع شدہ رقوم اکھٹی کرکے مجاہدین کے لئے نئے رنگروٹ ساتھ لے کر واپس سالماً غانماً اسمست پہنچ جاتے تھے۔ یہ قاصد ایسے سخت رازدار ہوتے تھے کہ کبھی ان کی تعداد جو وہ ہندستان سے لاتے تھے جماعت کے کسی فرد کو معلوم نہ ہو سکتی تھی۔ وہ پولیس کو دھوکہ دینے کے لئے عجیب عجیب طرح سے بھیس بدلتے تھے۔ کبھی یورپین، کبھی کابلی کے

طالبِ علم، کبھی سرحد کے رئیس زادہ کے لباس میں وہ سفر کرتے تھے، اور ہتھیلی پر سر رکھ کر جماعت کا کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کی حیرت انگیز جانبازی، ان کے اعلیٰ کیریکٹر ہندستانی مراکز کو مرعوب کرنے کے لئے کافی تھے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ باوجود اس قدر امین اور بے غرض ہونے کے وہ جماعت کے لئے حیرت انگیز جھوٹا پروپیگنڈا کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان اضداد کا پتلا ہے۔ یہ تضاد میں نے اکثر بہترین کمیونسٹ ورکروں میں بھی دیکھا ہے اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک بے غرض ایثار کا پتلا، امین و دیانت دار شخص کیوں کر ایسی جماعت کے لئے بے دریغ جھوٹا پروپیگنڈا کرنے سے نہیں جھجکتا۔ بلکہ اسے عین ثواب سمجھ کر کرتا ہے۔ شاید شیخ سعدیؒ نے ایسے ہی لوگوں کے حق میں کہا ہو کہ :-

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز

میری پوزیشن بھی جماعت میں عجیب تھی۔ میں رسماً اس کا رکن نہ تھا۔ کیوں کہ میں نے باقاعدہ بیعت نہ کی تھی لیکن اثر و رسوخ کے اعتبار سے میں جماعت کے بہترین کارکنوں میں سے تھا۔ امیر نعمت اللہ ہر مشورہ میں مجھے شریک کرتے بلکہ میری تحریک پر بہت سی اصلاحات بھی نافذ کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ جمعہ کا خطبہ بھی اکثر میں ہی دیتا اور باوجود میری صاف گوئی کے امیر صاحب کبھی مجھ سے کبیدہ خاطر نہ ہوتے۔ تمام مجاہدین کو بہت جلد اس امر کا احساس ہو گیا کہ میں ان کا حقیقی معنوں میں خیر خواہ ہوں۔ میرے اثر و رسوخ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب سے میں جماعت میں آیا تھا امیر صاحب کے قاصد میرا نام لے کر خوب پروپیگنڈا کرتے تھے کہ ہندوستان پر اب حملہ ہونے والا ہے۔ اس لئے لوگ دل کھول کر چندہ دیتے۔ چنانچہ بہت کافی مقدار روپیہ کی میری وجہ سے پہنچنا شروع ہوئی۔ ہر قاصد جو ہندستان سے آتا ضرور وہاں سے یہ پیغام لاتا کہ مولوی سلیمان کے

مشورے سے کام کیجئے۔ اس لئے قاصد بھی مجھ سے بے حد مانوس ہو گئے تھے اور اکثر اوقات مجھے ہندستان کے تمام حالات بتلا دیتے تھے۔ ان قاصدوں میں سے عبدالقادر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ ہمیشہ میرے پیغامات ہندستان کے اکثر لیڈروں کے پاس لے جاتے۔ چنانچہ میری ان کی وساطت سے حضرت مولانا محمود الحسن مرحوم کے بعض خاص شاگردوں سے، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم و مغفور، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر مرحوم (پ جھنڈ واڑہ) تک رسائی تھی اور میرا ان سے باقاعدہ نامہ و پیام انہی کی وساطت سے جاری رہتا اور اکثر اسکیمیں ان کے مشورے سے طے ہوتی تھیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عبدالقادر ہندستان کا چکر کاٹ کر ہری پور (ہزارہ) کے راستے اسمست جا رہا تھا اور دربند پہنچ کر وہ دریائے سندھ کے پار کرنے کو تھا کہ گورہ سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ گرفتار کر کے اس کا کوٹ اتار کر رکھ لیا اور اسے حوالات میں قید کر دیا۔ کوٹ میں بہت سا نقد روپیہ نوٹوں کی شکل میں تھا۔ اور روپیہ سے زیادہ ضروری خطوط تھے جو وہ ہندستان سے میرے نام لا رہا تھا۔ وہ خطوط اگر گورنمنٹ انگریز کے ہاتھ لگ جاتے تو ہندستان کے اکثر نامور لیڈروں پر سازش کا مقدمہ چل جاتا اور انھیں تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اور عصر کا وقت تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ عبدالقادر گرفتار ہو گیا ہے اور گوروں کی حوالات میں محبوس ہے۔ اس حوالات پر چار گوروں کا پہرہ ہے اور دوسری صبح اس کا کورٹ مارشل ہو گا۔ مجھے یہ بھی اطلاع مل گئی کہ اس کا کوٹ جس میں روپے اور نہایت ضروری خطوط تھے گوروں نے اتروا کر اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مجھے اس خبر سے شدید صدمہ ہوا کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے ایک اور مقدمہ سازش کا نقشہ کھنچنے لگا جس میں ہندستان کے بڑے بڑے

سرکردہ لیڈر گرفتار ہوکر پھانسی کی سزا پائیں گے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ افطار کے وقت کی دعا مسترد نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں نے افطار کے وقت نہایت گڑگڑا کر خدا کے حضور دعا کی کہ عبدالقادر کو نجات دے، پھر عشا کی نماز کے بعد اور نماز تراویح کے بعد نماز تہجد کے بعد اور پھر صبح کی نماز کے بعد دعا مانگ کر میں وہیں مسجد میں لیٹ گیا اور میری آنکھ لگ گئی۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ عبدالقادر آکر میرے پاؤں دبا رہا ہے۔ میں حیران اس سے پوچھتا ہوں کہ میں عبدالقادر تم کیسے آگئے۔ اس نے کہا کہ میں تہجد کے وقت حوالات میں تھا اور گوروں کا پہرہ تھا کہ اچانک ایک خضر صورت بزرگ تشریف لائے ان کے چہرے پر تولیہ پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے آتے ہی حوالات کا تالا کھولا اور میرا کوٹ مجھے دے کر کہا کہ اس میں تمہارا روپیہ اور کاغذات بھی موجود ہیں۔ چاروں بندر (یعنی کہ وہ پہرہ دار) سو رہے ہیں، تم چپکے سے نکل جاؤ اور پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ یہاں سے نکال دینا میرا کام تھا۔ اب بھاگ جانا تمہارا کام ہے۔ چنانچہ میں دریا کے کنارے آیا کشتی کھڑی تھی۔ میں بیٹھ گیا اور پار ہوگیا اور بھاگ کر یہاں آگیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بمشکل میرا خواب ختم ہوا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص میرے پاؤں دبا رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو عبدالقادر موجود تھا اور وہی میرے پاؤں دبا رہا تھا۔ میں نے اس سے اپنا خواب بیان کیا۔ اس نے قسم کھا کر بیان کیا کہ بالکل ویسا ہی معاملہ ہوا ہے۔ میں حوالات میں نماز تہجد کے لئے اٹھا کہ ایک نہایت بزرگ صورت شخص جیل کے دروازہ پر آئے۔ انھوں نے تالا کھولا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ ان کے پاس چابی تھی یا نہیں یا بغیر چابی کے ان کے اشارے سے تالا کھل گیا۔ کوٹ ان کے پاس تھا جس میں میرے روپے اور کاغذات بجنسہٖ موجود تھے۔ کوٹ

مجھے دے کر کہا کہ خدا کا شکر کرو۔ تمہاری مخلصی کا سامان اس نے پیدا کر دیا ہے۔ یہاں سے نکال دینا میرا کام تھا، اب بھاگ جانا تمہارا کام ہے۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔

انگریزی حکومت کے لئے عبدالقادر کا اس طرح نکل جانا بہت ہی حیران کن تھا کہ ایک نہایت مفید شکار ہاتھ میں آکر صاف نکل گیا۔ چنانچہ بعد میں مجھے صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم سے معلوم ہوا کہ اس واقعہ کا گورنمنٹ نے نہایت سخت نوٹس لیا اور ان پہرہ دار گوروں کا کورٹ مارشل ہوا۔ لیکن اس خبر کی اشاعت سے بالارادہ احتراز کیا گیا کیونکہ اس میں سرکار انگریزی کے حکام کی سبکی بھی اور لوگوں کو ان کی غفلت پر ہنسنے کا موقع ملتا۔

قصہ مختصر۔ انگریزی حکومت کی انتہائی کوششوں کے باوجود ہمارا پروپیگنڈا ہندستان میں پوری قوت سے ہوتا رہا اور اگر امیر حبیب اللہ اور امیر نعمت اللہ کی زرپرستی ہمارے آڑے نہ آتی تو ہم ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے۔ مجھے اس وقت رہ رہ کر کارلائل کا مقولہ یاد آتا کہ دنیا کی تاریخ بنانے میں ہیروز کا بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ہیروز ورشپ میں یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ میرا اپنا تجربہ بھی یہی ہے کہ انقلابی تحریکوں کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار زیادہ تر ان کے لیڈروں کی قابلیت پر ہوتا ہے ورنہ نہایت مساعد حالات کے باوجود بھی نااہل لیڈر ایک تحریک کو برباد کر دیتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ جیسے مساعد حالات ہمیں میسر آئے تھے وہ شاید ہی کبھی کسی انقلابی تحریک کو میسر آئے ہوں، مگر ہم نے جن لیڈروں کے ماتحت کام کیا وہ دونوں کے دونوں سخت نالائق، نااہل، خود غرض، ناکارہ اور حریص تھے۔ اسی لئے ہماری تحریک ناکام ہوگئی۔

گو مجھے امیر حبیب اللہ خاں مرحوم اور امیر نعمت اللہ مرحوم سے کامل

مایوسی ہو چکی تھی لیکن پھر بھی میں نے اور میرے ساتھیوں نے ہمت نہ ہاری اور ہاتھ پیر مارتے ہی رہے۔ چنانچہ میں نے اسمت میں بچّوں کے لیئے ایک مدرسہ جاری کیا۔ مجاہدین میں یہ پہلی کوشش تھی ان میں تعلیم پھیلانے کی۔ چنانچہ ایک شخص عبدالجبّار نے اپنی خدمات مجھے پیش کیں کہ وہ میرا کھانا پکا دیا کرے گا بشرطیکہ میں اسے مشکوٰۃ المصابیح پڑھا دوں۔ چنانچہ میں نے یہ معاہدہ کرلیا اور امیر نعمت اللہ صاحب سے اس کی منظوری لے لی۔ عبدالجبار امیر صاحب کا خاص آدمی تھا اور اس سے بعد میں مجھے امیر صاحب کے بہت سے پوست کندہ حالات معلوم ہوئے۔ درحقیقت امیر حبیب اللہ خاں اور امیر نعمت اللہ کی سب سے بڑی کمزوری عورتوں کی رغبت تھی اور اب بھی اگر دیدۂ عبرت سے دیکھا جائے تو ہمارے مسلمان بادشاہوں اور رؤسا کی سب سے بڑی کمزوری یہی صنفِ نازک کی رغبت ہے۔ چنانچہ ہم سب نے مل کر یہ طے کیا کہ بیرونی دشمن کے خلاف ہم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے جب تک کہ ہم اندرونی دشمنوں کے خلاف جہاد نہ کریں۔ اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے

"افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جائر"

(سب سے بہتر جہاد جابر سلطان کے خلاف سچّی بات کہنا ہے)

اسلام کی سب سے بڑی کمزوری یہی اندرونی دشمن ہیں اور ہماری پچھلی تاریخ کے اوراق انھیں بدبخت غدّاروں کی خود غرضی، ملّت فروشی، ہوس جاہ وزر کی المناک داستانوں سے سیاہ ہیں۔

لیکن اس اندرونی انقلاب کے لئے ہمیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ بدقسمتی سے ہمیں مسلمانوں کے کیرکٹر کا بہت تلخ تجربہ ہوا، اور سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں قومی کیرکٹر تو شاید پیدا ہی نہیں ہوا، اور نہ سیاسی شعور پیدا ہوا ہے۔ افغانستان میں ہم نے معدودے چند ممتاز ہستیوں کے علاوہ بہت کم لوگوں کو

دیانتدار اور امین پایا۔ وہاں کے اکثر زعما دو طرفہ جاسوس تھے، یعنی امیر صاحب تک ہر ایک بات کو پہنچانا اور انگریز سفیر مقیم کابل کو بھی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پہنچانا ان کا ادنی کرشمہ تھا۔ اس لئے ہمیں بہت ہی پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑا۔ ہر شخص کو انگریزی اور افغان جاسوس سمجھ کر کام کرنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں امیر حبیب اللہ یا امیر نعمت اللہ کے خلاف انقلاب برپا کرنا کس قدر کٹھن کام تھا۔ مگر ہماری مساعی جاری رہیں مگر افسوس ہے کہ امیر حبیب اللہ اور امیر نعمت اللہ دونوں بعد از وقت قتل ہوئے ورنہ اگر وہ ایک سال پہلے قتل ہو جاتے تو ہماری تحریک پوری کامیاب ہو جاتی اور امیر نصر اللہ خاں (برادر امیر حبیب اللہ خاں) ضرور ہندستان پر حملہ کر دیتے اور جنگ کے آخری ایام میں یہ حملہ بہت فیصلہ کن ثابت ہوتا۔

گئے تھے داد پانے جن سے ہم کچھ خستہ حالی کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

یاغستان میں کام شروع کرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے بیرونی ممالک سے رابطہ پیدا کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ اس بارے میں ہمیں جرمن کمیشن کے ہیڈ ڈاکٹر فان ہنٹنگ سے جن کا ذکر ہم کابل کے ضمن میں کر آئے ہیں بہت مدد ملی۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ہم جرمن گورنمنٹ سے منسلک ہو جائیں۔ تو ہمیں ہتھیار اور پیسہ جلد اور کافی مقدار میں پہنچ سکے گا۔ چنانچہ ہم نے دو تین دفعہ کوشش کی مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ پہلی دفعہ ایک سکھ ڈاکٹر جو بنگال کی دہشت پسند جماعت کے رکن تھے اور جن کے خلاف انگریزی حکومت نے دفعہ ۱۲۱ کے تحت وارنٹ جاری کر رکھے تھے ہندستان سے فرار ہو کر میرے پاس کابل میں ہی

پہنچ گئے تھے اور چونکہ وہ منگل کے دن ہمارے پاس پہنچے اس لیے ہم نے ان کا نام ڈاکٹر منگل سنگھ رکھ دیا تھا۔ جب میں یاغستان پہنچا تو وہ بھی میرے پاس پہنچ گئے۔ فان ہینٹگ کے مشورے سے یہ تجویز ہوا کہ ڈاکٹر منگل سنگھ ایران کے راستے ترکی اور جرمنی جائیں اور ان دونوں سلطنتوں کے ساتھ ہمارا رابطہ قائم کریں۔ ان کے ساتھ دو اور مہاجر لڑکے لئے گئے۔ ڈاکٹر منگل سنگھ نہایت نڈر اور جری کارکن تھے۔ کئی دفعہ وہ جرمنی جانے سے پہلے ہندستان ہو کر آئے تھے۔ وہ درّانہ سکھوں کے ہاں چلے جاتے اور روپیہ وغیرہ لے کر واپس آجاتے ہندوستان کے اکثر ہندو لیڈروں کے ساتھ میرا نامہ و پیام انہی کی وساطت سے ہوتا تھا۔ جب انھیں کہا گیا کہ برلن جاؤ تو وہ نہایت خوشی سے تیار ہو گئے۔ مگر افسوس کہ وہ ایران میں گرفتار ہو گئے۔ ان کے ساتھی تو بھیس بدل کر نکل گئے مگر وہ بچ نہ سکے۔ چنانچہ روسی سپاہیوں نے انھیں انگریزی سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ وہاں سے وہ ہندستان لائے گئے اور پنجاب ہائی کورٹ میں ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ ایک انگریز جج اس مقدمہ کی سماعت کے لئے مقرر کیا گیا۔ جب استغاثہ کی شہادت ختم ہو گئی تو جج نے کہا ڈاکٹر کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟ اس شیر مرد نے کہا کہ "میں اپنے ڈیفنس میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کیونکہ میں انگریزوں کو غاصب اور ظالم یقین کرتا ہوں۔ ہندستان ہمارا ہے اور ہم میں سے ہر ایک سچے ہندی کا فرض ہے کہ انگریز کے خلاف جہاد کرے اور انھیں ہندوستان سے نکال کر دم لے۔ لیکن مسٹر جج، میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ جس طرح آج میں باغیوں کے کٹہرے میں کھڑا ہوں اسی طرح ایک دن آنے والا ہے جب میرے ہم قوم جج ہوں گے اور آپ کے ہم قوم مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں گے اور ان سے ان کی سیاہ کاریوں کی جواب طلبی کی جائیگی۔ آپ کے جی میں جو آئے مجھے سزا دیجئے۔ مگر خدا کی عدالت کا دروازہ بھی کھلا ہے۔ جہاں آپ سب کو اپنے جرائم

کی سزا بھگتنی پڑے گی۔" جج نے ڈاکٹر منگل سنگھ کو پھانسی کی سزا دی۔ فیصلہ سن کر ڈاکٹر مسکرایا اور کہا کہ میری آخری تمنا پوری ہوئی اور میں اپنے ملک پر جان دے رہا ہوں۔ چنانچہ فیصلہ کے دن سے پھانسی کے وقت تک اس بہادر مرد کا کوئی بارہ پونڈ وزن بڑھ گیا۔ جس دن ڈاکٹر منگل سنگھ کو پھانسی کی سزا دی گئی اُس دن اُن سے پوچھا گیا کہ آپ کی آخری خواہش کیا ہے تو اُنھوں نے کہا کہ میری آخری خواہش یہ ہے کہ میری موت انگریزی کفن میں آخری کیل ثابت ہو۔

سر مائیکل اوڈوائر جو اس زمانے میں پنجاب کے گورنر تھے، ہماری تحریک کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ "مجھے بہت خوشی ہے کہ سرکار کے دو بدترین دشمنوں میں سے ایک کو تو پھانسی کی سزا مل چکی ہے اور وہ ختم ہو چکا ہے۔ دوسرا دشمن (یعنی محمد علی راقم الحروف) پہاڑوں میں بھاگا پھرتا ہے۔ مگر اسے معلوم نہیں کہ سرکار انگریزی کا ہاتھ بہت لمبا اور مضبوط ہے۔ جس طرح ہم نے اس کے رفیق ڈاکٹر منگل سنگھ کو پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اسی طرح اسے بھی گرفتار کر کے تختۂ دار پر لٹکائیں گے تاکہ سرکار کے دشمنوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہو۔" اس کے بعد سر مائیکل اوڈوائر، سر جارج راس کیپل گورنر صوبۂ سرحد، صاحبزادہ عبدالقیوم پولیٹکل ایجنٹ پشاور و خیبر نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح مجھے پکڑیں اور پھانسی دیں، مگر خدا کی مہربانی سے میں ان کے شر سے محفوظ ہی رہا۔

دوسری دفعہ ہم نے شیخ محمد ابراہیم صاحب مرحوم کو جو میرے ساتھ حبیبیہ کالج کابل میں تاریخ کے پروفیسر تھے اور میرے ساتھ یاغستان آئے تھے دو اور رفقائے کار کے ساتھ ایران کے راستے ٹرکی بھیجا۔ مگر افسوس کہ وہ راستے میں ہی شہید کر دیئے گئے۔ ان کے صحیح حالات ہم تک نہ پہنچ سکے کیونکہ ان کے دونوں

ساتھی بھی شہید کر دیے گئے اور اُن کی شہادت کی خبر بھی ہیں ایک قافلے سے ملی

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

تیسری دفعہ ہم نے جب وفد بھیجا تو روس میں انقلاب عظیم برپا ہو چکا تھا اور بولشویک لینن کی سرکردگی میں روس کے ذرو بست پر قابض ہو چکے تھے۔ ہمیں ان سے بہت زیادہ توقعات تھیں اور لینن نے بہت زبانی ہمدردی کی۔ ہمارے سفرا کو بہت عزت سے شرف باریابی بخشا اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا اس لئے اس کا ذکر ذرا تفصیل کا محتاج ہے۔ مگر افسوس کہ وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے اور ان کی حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں۔

روس کے عظیم الشان انقلاب کے آثار ۱۹۱۷ء کے شروع میں ہی ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے اور اخباری خبروں سے ہماری توقعات بہت زیادہ روس کی شکست سے وابستہ ہو چکی تھیں۔ ہمیں یقین تھا کہ روس ہتیار ڈال دے گا تو جرمن افواج فرانس اور انگریز کا کچومر نکال دیں گی۔ چنانچہ ہم نے زیادہ تن دہی سے کام کرنا شروع کیا تاکہ ادھر روس ہتیار ڈالے اور ادھر ہم ہندستان پر حملہ کر دیں۔ خود ہندستان میں بھی بغاوت کے لئے مواد تیار ہو چکا تھا۔ ہمیں اب یقین ہو چلا تھا کہ ہم خود انگریز کو ہندستان سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یاغستان کے تمام قبائل میں بنیر کے لوگ زیادہ تر بزدل سمجھے جاتے ہیں مگر روس کی خبروں سے تمام قبائل میں ایک برقی لہر دوڑ گئی تھی اور اس کا اثر بنیر اور امب پر بھی ہوا اور وہ لوگ دل سے ہمارے ساتھ ہو گئے اور انھوں نے یقین دلایا کہ ہم تمہارے ساتھ

ہیں۔ خود نواب امب مرحوم ہماری تحریک میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگے اور خفیہ خفیہ ہم سے ملاقاتیں کرتے اور ہمیں ہر ممکن تعاون کا یقین دلاتے۔ نواب امب و دربند محمد زماں خاں مرحوم بہت خلیق اور ہوشمند رئیس تھے اور ہم سے ملاقات میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ایسا اوقات ان ملاقاتوں کی اطلاع ان کے ولیعہد نواب محمد فرید خاں موجودہ نواب دربند و امب کو بھی نہ ہوتی تھی [۱]

جرمن کمیشن کے ساتھ جس کا ذکر میں کابل کے واقعات میں کر آیا ہوں، دو پٹھان افسر انگریزی فوج سے مفرور بھی تھے۔ ان کے نام تو مجھے یاد نہیں، لیکن چونکہ ان کا تعلق قبائلی علاقے سے تھا اس لئے وہ ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہوئے۔ وہ دونوں انگریزی فوج میں صوبے دار میجر تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جو فرانس کے میدان سے بھاگ کر جرمنوں سے جا ملے تھے۔ جرمنوں نے ان کی خوب خاطر مدارات کی اور ہندستان پر حملہ کے لئے ان سے ہر طرح کی واقفیت حاصل کی۔ جب ہم یاغستان کے ارادے سے کابل سے فرار ہوئے تو ہمارے یاغستان پہنچنے کے بعد یہ دونوں سردار ہم سے آکر مل گئے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے تو یاغستانیوں کو تربیت عسکری دینی شروع کی جس کا ذکر میں موجودہ مضمون میں کر چکا ہوں۔ بعد میں جب میں اسمت آیا تو وہ ملا بشیر کی معیت میں تیراہ اور محسود علاقہ میں گئے۔ اس علاقے میں ان کے اثر سے ملا بشیر کا دورہ بہت کامیاب رہا اور وہاں کی نوجوان پارٹی دل سے ہمارے ساتھ ہو گئی۔

---

[۱] محمد زماں خاں کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے:۔

محمد فرید خاں موجودہ ابن محمد زماں خاں ابن محمد اکرم خاں ابن پایندہ خاں انھوں نے سید احمد بریلوی کا زمانہ پایا تھا۔

چنانچہ ان کی مدد سے ہم نے بہادر خیل (ضلع کوہاٹ) کی کسٹم چوکی پر بہت کامیاب حملہ کیا۔ مگر وہاں کے اکثر خوانین انگریزوں کے تنخواہ خوار تھے۔ اس لئے وہ منافقانہ پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نفاق پٹھان قوم کے لیڈروں کے خمیر میں سرایت کر چکا ہے اور اس کی وجہ صرف انگریزی روپیہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو قبائلی انگریزی روپیہ کے لالچ کے اسیر نہ تھے وہی بڑے پکے اور راستباز مسلمان تھے مگر ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔ اس عرصے میں پشاور شہر پر بھی دو کامیاب ڈاکے پڑے۔ مگر ان ڈاکوں میں خود صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم کا ہاتھ تھا۔

اِن ڈاکوں کی داستان بھی عجیب و غریب ہے۔ یہ بات تو اب معلوم عوام ہے کہ انگریز کو سرحدی ڈاکوں سے محفوظ رہنے کے لئے سالانہ بہت بڑی رقم خرچ کرنی پڑتی تھی اور ایک فنڈ خاص اس غرض کے لئے مخصوص تھا جس کا کوئی حساب کتاب نہ تھا۔ نہ کوئی رسید نہ کوئی ریکارڈ اور نہ آڈٹ۔ ظاہر ہے کہ اس فنڈ کی وجہ سے بڑے کارکنوں اور بالخصوص سر جارج روس کیپل اور صاحبزادہ عبدالقیوم کو خوب، ہاتھ رنگنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس لئے جہاں ذرا امن ہوا تو ہندستانی محکمۂ خارجہ کی طرف سے سر جارج اور صاحبزادہ عبدالقیوم کو تاکید ہوتی تھی کہ بے حساب رقم کے عنوان میں کمی کریں۔ چنانچہ جب کبھی ایسی تاکید ہوتی تو صاحبزادہ صاحب باغستانی قبائلیوں کو اشارہ کر دیتے کہ تم لوگ ذرا زیادہ زور شور سے ڈاکے ڈالو۔ چنانچہ پشاور سے صاحبزادہ صاحب کے آدمی وقتاً فوقتاً مجھ سے بھی ملنے کے لئے آتے تھے۔ اور پشاور پر جو ڈاکے

پڑے وہ ان کے ایما سے ہی ڈالے گئے تھے، لیکن ہمارے ڈاکوں سے صاحبزادہ صاحب کا مقصد فوت ہوگیا۔ کیونکہ تیراہی ملک وغیرہ جب ڈاکے ڈالتے تھے تو وہ ہندو عورتوں کو اور ہندو مال کو زیادہ تر لوٹتے تھے۔ مگر ہم نے جو ڈاکے ڈالے تو وہ خاص چھاؤنی پر ڈالے اور بہت سے اسلحہ جبراً چھین کر لے آئے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس سے صاحبزادہ اور سر جارج کی بہت سخت بدنامی بھی ہوئی۔ مگر انگریزی حکومت ان دونوں حضرات کی اس قدر محتاج تھی کہ ان کے خلاف لب تک نہ ہلا سکی اور یہ معاملہ دبا دیا گیا۔

الغرض ہماری تمام مساعی اس دوران میں صرف انگریزی حکومت کو پریشان کرنے تک محدود رہیں۔ ہم نے مردان کی تحصیل پر ڈاکہ ڈالا اور ادھر پھر شبلقدر اور مچنی پر باقاعدہ شبخون مارے، لیکن اس سب کام کی قدر و قیمت اس سے زیادہ نہ تھی کہ انگریزوں کو اپنی سرحدات پر افواج رکھنے کے لئے کثیر مصارف برداشت کرنا پڑتے تھے۔ انگریزی میں اس کی قیمت کو ہم **(nuisance value)** سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ خود انگریزی رپورٹوں میں تھا کہ ایک سال میں گورنمنٹ انگریز کو سینتیس کروڑ سے زائد روپے صرف اپنی سرحدات کو محفوظ رکھنے کے لئے صرف کرنے پڑے۔ لیکن ان سب کوششوں کا کوئی تعمیری نتیجہ برآمد نہ ہوسکا بلکہ انگریزوں نے امیر حبیب اللہ خاں پر اور زیادہ زور دینا شروع کیا کہ ان کے ایجنٹ یعنی میں اور ملا بشیر علانیہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کا پروپگنڈا کر رہے ہیں اور امیر صاحب کو چاہیئے کہ وہ ان سے بالکل قطع تعلق کرلیں۔ چنانچہ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ جب ملا بشیر اپنے معمول کے مطابق اپنی

کارگذاری کی رپورٹ پیش کرنے کے لئے کابل گئے تو امیر حبیب اللہ خاں نے پہلے کی طرح ان سے علانیہ ملاقات نہ کی، بلکہ خود امیر نصر اللہ خاں کے محل میں تشریف لے گئے جہاں ملا بشیر پہلے سے موجود تھے اور وہیں انھوں نے امیر صاحب کی خدمت میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اسے سن کر امیر صاحب نے کچھ مایوسی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ جب تک کوئی بیرونی مدد ہمیں نہیں مل جاتی ہم انگریزوں سے قطع تعلق نہیں کر سکتے اور علانیہ ان سے کسی قسم کا بگاڑ نہیں پیدا کر سکتے۔

ملا بشیر کی واپسی کے بعد ہم نے اسمست میں ایک مجلس مشاورت منعقد کی اور فیصلہ کیا کہ روس کے راستے جرمنی پہنچنے کی کوشش ایک دفعہ اور کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ان دونوں قبائلی سرداروں نے کہا کہ ہم جائیں گے اور اگر ممکن ہوا تو لینن سے ملیں گے۔ چنانچہ وہ دونوں سردار اور دو نوجوان ہماری جماعت کے اس خطرناک مہم کے لئے تیار ہوئے۔ امیر حبیب اللہ خاں نے دریردہ ہر قسم کی اعانت کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ان کے پروانہ ہائے راہداری افغان حکومت کی طرف سے نائب السلطنت امیر نصر اللہ خاں نے تیار کرا دیئے اور وہ کابل سے مزار شریف اور وہاں سے بخارا کے راستے ماسکو تک پہنچے۔ ان کا سفر کافی دل چسپ اور محیر العقول کارناموں سے مزین تھا مگر اس کی تفاصیل اس وقت مجھے پوری طرح محفوظ نہیں، لیکن میں نے ان کی غیر حاضری کو غنیمت جان کر سندھ کرّی[1] (وادیٔ سندھ) کا دورہ کیا۔

---

[1] سندھ کرّی جس کا ذکر میں اوپر بھی کر آیا ہوں جو دریائے سندھ کے اُس پار یعنی قبائلی علاقہ کی طرف وادی ہے۔ دریائے سندھ کے اس پار یعنی انگریزی علاقہ میں اس کے بالمقابل بالاکوٹ، وادیٔ کاغان وغیرہ ہیں۔

اِس دورہ کی کوئی فوجی یا انقلابی اہمیت نہ تھی مگر پھر بھی اس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

میں نے یاغستان کے دو تین بڑے تجربہ کار آدمیوں اور مجاہدین میں سے دو یا تین آزمودہ کار رفقا کو لیا۔ ان لوگوں کو اِس علاقہ کا کافی تجربہ تھا اور وہ اس وادی کے دشوار گزار راستوں سے خوب واقف تھے۔ میرا دورہ محض اِس علاقہ کی سیاحت کی غرض سے تھا اس لئے میں اس کی تفصیلات پیش نہیں کروں گا۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ سندھ کنڑی کے بالمقابل انگریزی علاقہ تھا اس لئے میرے لئے دریائے سندھ کو عبور کرنا ممکن نہ تھا ورنہ شاید گرفتار ہو جاتا۔ وہ علاقہ نہایت خوبصورت ہے۔ میں نے دریائے رہائن کی وادی (Rhine Valley) واقع جرمنی کی سیاحت کی ہے۔ کشمیر کے اکثر حصے دیکھے ہیں، جنوبی فرانس کی سیر گاہوں کی بادپیمائی کی ہے اور سوئٹزرلینڈ کے بہترین مناظر دیکھے ہیں۔ لیکن میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ قدرتی حسن، نیچرل مناظر، آب و ہوا کی عمدگی، خودرو پھولوں کی خوشبو اور مہک، سبزہ زار کی دل فریبی میں شاید ہی وہ اس علاقے کی ہم سری کر سکتے ہوں۔ میں اِس علاقے کی دولت کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ افسوس اتنا بڑا اور خوبصورت علاقہ انسان کی غفلت سے ابھی تک یوں ہی پڑا تھا۔ میں نے وہاں ہزارہا قسم کی تیتریاں دیکھیں۔ سب سے بڑی تیتری کے پر شاید بڑی انسانی ہتھیلی سے دو گنے ہوں گے اور سب سے چھوٹی تیتری جگنو سے کچھ بڑی ہو گی۔ ان کے رنگوں کا تنوع اور پروں کی خوبصورتی الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ کسی ماہر حیوانیات کے لیے ان کا مطالعہ نفع سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کوئی سفید مخملی رنگ کی کوئی قرمزی، کوئی بنفشئی،

کوئی زرد اور کوئی لاجوردی کسی میں ان رنگوں کا ایسا خوبصورت امتزاج تھا کہ

جی چاہتا تھا قدرت صانع پہ ہوں نثار

بہترین کاغذی اخروٹ' خودرو بنفشہ ہزار' عنابوں کے جنگل اور بے شمار جڑی بوٹیاں وہاں پیدا ہوتی ہیں۔ میرے ہم راہی جو اس علاقے سے واقف تھے کہتے تھے کہ ان جڑی بوٹیوں میں حیرت انگیز تاثیرات ہیں۔ بعض کنین کا بدل ہیں بعض نمونیا میں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ بعض میں اعادہ شباب کی خاصیت ہے' یہاں تک کہ سفید بال بھی سیاہ ہو جاتے ہیں۔ بعض گٹھیا اور بال چر کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔ بعض استسقاء کا حکمی علاج ہیں۔ میں کوئی جڑی بوٹیوں کا ماہر نہیں ہوں لیکن ہماری حکومت کا فرض ہے کہ وہ اس طبی دولت کا سراغ لگائے اور ایسے ریسرچ سکالر وہاں بھیجے جو ان بوٹیوں کے خواص معلوم کریں۔ مجھے بعد میں ہندستان آکر معلوم ہوا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے کرنل چوپڑا۔ آئی۔ ایم۔ ایس۔ کی سرکردگی میں ان ادویہ کی ریسرچ کا کام کلکتہ میں شروع کیا ہے۔

علاوہ بریں میں نے وہاں پہاڑوں میں کوئلے کی موجودگی اور لوہے اور تانبے کی قیمتی دھاتوں کی موجودگی کے بھی آثار پائے۔ میں کوئی ماہر معدنیات نہیں ہوں لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ سندھ کی یہ وادی معدنی دولت سے مالا مال ہے اور ممکن ہے کہ وہاں ہمیں (Radio Active) معدنیات بھی ملیں۔ بہرحال اب چونکہ وہ سارا علاقہ ہمارا ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اچھی طرح سے اس کی جانچ پڑتال کر کے اس کے معدنی دولت کا سراغ لگائیں اور اس کی غیر متناہی برقابی قوت سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کو امریکہ بنا دیں۔

سندھ کٹری میں آبادی بہت قلیل ہے اور جگہ جگہ جھونپڑیوں میں لوگ رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں بالعموم نہایت خوبصورت' دراز قد' سفید فام ہوتی ہیں۔

ان کے بال سنہری، پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی اور بھوری، سر کے بالوں کو وہ بھونڈے طریق پر رکھتی ہیں۔ عموماً کئی کئی چوٹیاں ہوتی ہیں۔ ان کے لباس ہیں نیلی شلوار جس پر کئی پیوند لگے ہوتے ہیں اور ایک لمبا سا کرتہ نیلے یا سیاہ رنگ کا اور سر پر چھوٹا سا ٹکڑا بطور دوپٹے کے ہوتا ہے۔ وہ لوگ صابن سے قریباً ناواقف ہیں اور نہانا وغیرہ بھی ان کے لئے ایک بہت غیر معمولی تکلف کی بات ہے۔ کپڑے پر پیوند پر پیوند لگائی جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ بالکل ناکارہ ہو کر پھینکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی حال مردوں کا ہے۔ وہ بہت خوش شکل، سڈول اور محنتی ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کی غذا صرف مکّی کی روٹی ہوتی ہے۔ وہ سالن یا دال سے قریباً ناآشنا ہیں۔ ہاں شہد کی مکھیاں، بکری اور بھینس ان کے پالتو جانور ہیں جن کے دودھ اور مکھن اور لسّی کو وہ بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ مکّی کی روٹی کو عموماً لسّی کے ساتھ گھی سے چپڑ کر کھانا ان کی بہترین اور پُرتکلّف غذا ہے۔ مکّی بہت میٹھی ہوتی ہے اور بھٹّا بھی ہمارے بھٹّے سے قریباً دوگنا ہوتا ہے۔ یوں تو جانوروں کا گوشت بھی وہاں بکثرت مل سکتا ہے۔ چکور، تیتر، برفانی تیتر، برفانی چکور، مرغ وغیرہ بکثرت مل سکتے ہیں۔ ان کو بھی وہ صرف آگ پر بھون کر کھا لیتے ہیں۔ ہنڈیا میں پکانے سے وہ قریباً ناآشنا ہیں۔ مکّی کی روٹی بھی وہ پتھروں پر سینک کر پکاتے ہیں کیونکہ میں نے تو وہاں توا نہیں دیکھا۔ پتھر پر پکی ہوئی مکّی کی روٹی نہایت لذیذ ہوتی ہے۔

قصہ مختصر ان کی زندگی بالکل بدویانہ ہے۔ سردی بہت سخت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جون، جولائی میں ہمیں پوستین اور لحاف کی ضرورت ہوتی تھی مگر ان لوگوں میں جفاکشی کے باوجود وحشت اور بربریت نام کو نہیں۔ وہ بہت بردبار، مہمان نواز، صادق القول لوگ ہیں۔ ابھی تک موجودہ تہذیب و تمدن کو ان کے اخلاق بگاڑنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

میں جب اسمست پہنچا تو میں نے امیر نعمت اللہ سے معدنی دولت اور پہاڑی لکڑیوں کی افراط وغیرہ کا ذکر کیا مگر انھوں نے کہا کہ ہم لوگ تو انگریز کے ڈر کے مارے اِن علاقوں کے حالات شائع نہیں کرتے ورنہ انگریز کبھی کا اِن علاقوں کو مسخر کر کے ان کی دولت کو اپنے قبضہ میں لا چکا ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اتنے میں سردار صاحبان بھی اپنے سفر سے واپس مع الخیر پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے نہ صرف انقلاب روس پر خوب روشنی ڈالی بلکہ لینن سے ملاقاتوں کی تفصیل بھی بیان کی۔ لینن نے بہت ہمدردی اور عزت سے انھیں اپنے ہاں مہمان رکھا۔ ہماری ساری سکیم کو سُنا اور کہا کہ افسوس کہ ہم اس وقت چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان سے نپٹ لیں تو پھر آپ کی اعانت کریں گے بشرطیکہ امیر حبیب اللہ مزاحم نہ ہوں، لیکن انھوں نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم پورے زور سے گوریلا جنگ جاری رکھیں کیونکہ سرمایہ دار سلطنتوں کو پریشان کرنا ہی وقت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ اگر بخارا کا راستہ صاف ہو گیا تو ہم افغانستان کے راستے آپ کی ہر ممکن اعانت کریں گے کیونکہ لینن کو ہماری اس رائے سے اتفاق تھا کہ مغربی امپیریلزم کا سر کچلنے کے لئے انگریزوں پر کاری ضرب لگانا نہایت ضروری ہے۔

ایک بات اور نہایت ہی عجیب ان سے معلوم ہوئی لیکن بعد میں باوجود تحقیقات کے اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔ صرف حضرت مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم نے جلاوطنی سے واپسی پر مجھ سے لاہور میں اس واقعہ کی تائید کی۔ اس لئے میں اسے بھی سپردِ قلم کرنا نامناسب نہیں خیال کرتا۔

روس کے انقلاب کے دوران میں لینن کو یہ یقین ہو گیا کہ بنی نوع انسان کو خدا کے خیال سے چھڑانا محالات سے ہے اس لئے اگر ایسا مذہب اختیار

کرلیا جائے جو کمیونسٹ اصولوں کے ساتھ چل سکے تو کمیونسٹ انقلاب سرعت سے تمام دنیا میں پھیل سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمیں مذہب اسلام اختیار کرلینا چاہیئے۔ اس خیال کو انھوں نے اپنی پارٹی کے ایک خفیہ اجلاس میں پیش کیا۔ پارٹی میں سخت ہنگامہ بپا ہوگیا۔ لینن نے کہا کہ اس طرح ہنگاموں سے کام نہ بنے گا۔ تم بھی غور کرو اور میں بھی سوچ بچار کرتا ہوں۔ اگلے سال اس مسئلہ پر پھر بحث کریں گے۔ چنانچہ پارٹی کا جلسہ برخاست ہوگیا۔ اور لینن نے تحقیقات شروع کردی۔

لینن کے اس ارادہ کی خبر اسلام کے ازلی دوستوں یعنی انگریزوں کو بھی ہوگئی۔ چنانچہ انھوں نے فوراً ایک فتویٰ اس مضمون کا لکھوایا کہ روس بولشویک خدا اور رسول کے دشمن ہیں اور بولشوزم ہر مذہب کو مٹانے کے درپے ہے۔ اس لئے اس کے خلاف ہتھیار اٹھانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس فتوے پر مصر، حجاز، شام، ایران، ہندستان کے جلیل القدر علما کے دستخط تھے۔ وہ فتویٰ کئی زبانوں میں چھاپ کر بطور اشتہار روس میں تقسیم کیا گیا۔ اس کی اطلاع جب لینن کو ملی تو وہ مذہب اسلام کی طرف سے مایوس ہوگئے کہ اس مذہب کے علما بھی رجعت پسندی میں عیسائی علما سے کسی طرح کم نہیں ہیں اور اس نے مذہب اسلام اختیار کرنے کا خیال ترک کردیا۔ مولانا سندھی مرحوم فرماتے تھے کہ میں نے سٹالن سے ایک ملاقات کے دوران میں اسلام کی خوبیاں بیان کیں تو وہ کہنے لگے کہ مولانا جو کچھ آپ کہتے ہیں ممکن ہے صحیح ہو اور میں آپ کی تکذیب نہیں کرتا، لیکن کیا آپ ایک اسلامی ملک بھی ایسا بتلا سکتے ہیں جہاں پر اسلامی قانون کی حکومت ہو یا اسے خلافت راشدہ کا مثنیٰ قرار دیا جاسکے۔ مولانا فرمانے لگے کہ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

آمدیم برسر مطلب۔ دراصل ہمارا یہ مشن بھی ناکام رہا کیونکہ لینن کی موعودہ

امداد نہ پہنچ سکی اور ہماری کوششیں تمام تر گوریلا جنگ یا ڈاکہ زنی تک محدود رہیں۔ اب ہمیں بھی یقین ہو چلا تھا کہ ہماری سکیم کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ یورپ میں جنگ کا نقشہ اب بدلنے لگا تھا بلکہ امریکہ کی آمد سے جنگ کا نقشہ بالکل بدل گیا اور اتحادیوں کی فتح کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ امیر حبیب اللہ خاں تو اب علانیہ انگریزوں کی حمایت کرنے لگے اور ہمیں ہر ممکن طریقے سے دبانا شروع کیا۔

قبائلی بھی انگریز سے مسلسل برسرپیکار نہ رہ سکتے تھے اس لئے ان کے جرگوں نے اب صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ چنانچہ اس جنگ کے دوران میں بھی یہی ہوتا تھا کہ تین چار ماہ کی ڈاکہ زنی کے بعد قبائلی روپیہ لے کر تین چار ماہ کے لئے خاموش بیٹھ جاتے تھے۔ مگر جب ۱۹۱۸ء میں قبائلیوں کے جرگے صلح کے لئے سر جارج روس کیپل (چیف کمشنر) کے پاس آئے تو انھوں نے صلح کی پیشکش کے ساتھ ایک نئی شرط پیش کی کہ تم لوگ مولوی سلیمان کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس پر قبائلیوں نے صاف انکار کر دیا۔ مگر سر جارج نے کہا کہ ہم انھیں گرفتار نہیں کرنا چاہتے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان آکر مقیم ہو جائیں سر جارج بھی قبائلیوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ کیوں نہ مولوی سلیمان مجھ سے آکر بالمشافہ گفتگو کر لیں۔ بعض ملکوں نے کہا کہ آپ انھیں دعوت دیں۔ چنانچہ میرے نام باقاعدہ سرکاری دعوت نامہ صاحبزادہ عبدالقیوم خاں مرحوم پولیٹکل ایجنٹ خیبر کی طرف سے بھیجا گیا۔ جب یہ دعوت نامہ اسمست پہنچا تو امیر نعمت اللہ اور ملا بشیر نے چند مخلص احباب کو بلوا کر ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ بہت بحث و تمحیص کے بعد جس میں میں خود بھی شریک تھا یہ فیصلہ ہوا کہ میں اس دعوت کو قبول کر لوں۔

شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد

مجھے پشاور کے سفر کی صحیح تاریخ یاد نہیں۔ مگر غالباً جولائی ۱۹۱۸ء میں ڈپٹی برکت علی صاحب کی معیت میں میں پشاور پہنچا۔ صوبہ سرحد کی گورنمنٹ نے ہمارا بہت پُرتپاک استقبال کیا اور ہمیں شاہی مہمان کی حیثیت سے صاحبزادہ سرعبدالقیوم کے ہاں رکھا گیا۔ صاحبزادہ صاحب مرحوم نے ہماری خاطرداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ مگر پیشتر اس کے کہ میں پشاور کے حالات تفصیل سے قلمبند کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے رفیق سفر ڈپٹی برکت علی صاحب کا تعارف ناظرین سے کرا دوں کیونکہ ان کا اثر ہماری گفتگوئے صلح پر بہت گہرا پڑا۔

ڈپٹی برکت علی صاحب مرحوم (یہی ان کا اصلی نام تھا) گوجرانوالہ (پنجاب) کے رہنے والے اور پنجاب میں سینئر سب جج تھے۔ ۱۹۱۰ء میں ان کے پنشن پر ریٹائرڈ ہونے کا زمانہ قریب تھا کہ سرشادی لال چیف جج ہائی کورٹ لاہور کے عتاب میں آ گئے اور ان پر دو مقدمات رشوت ستانی کے بنا دیئے گئے۔ ان میں انہیں ہر دو مقدمات میں دو۔ دو سال قید کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ ڈپٹی برکت علی صاحب کی عمر اس وقت پچپن سال کے لگ بھگ تھی۔ اس پیری میں بجائے پنشن کے قید بامشقت کی سزا کا ملنا ان کے لئے روح فرسا تھا۔ وہ والد صاحب قبلہ مرحوم ومغفور کے پرانے دوست تھے۔ والد صاحب مرحوم ومغفور نے نہ صرف ان کی طرف سے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی بلکہ پانچ ہزار روپیہ کی ضمانت پر انہیں دوران سماعت اپیل کے لئے رہا کروا لیا۔ والد صاحب قبلہ کو یقین تھا کہ سرشادی لال اپیل کو مسترد کریں گے۔ اس لئے فیصلہ سے ایک دن پہلے انہوں نے پرائیویٹ طور پر ہائی کورٹ سے پتہ لیا کہ کیا فیصلہ سنایا جانے والا ہے۔ انہیں اطلاع ملی کہ حسب توقع ضمانت منسوخ اور قید کا حکم بحال رہے گا۔ رات کو مشورہ

ہوا۔ اب یا تو ڈپٹی صاحب کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا یا پھر انھیں سرحد پار بھیج کر زرِ ضمانت ضبط کروالیا جاتا۔ والدصاحب قبلہ نے اپنے مالی نقصان کو ترجیح دیتے ہوئے اسی رات ڈپٹی صاحب کو ہری پور ہزارہ کے راستے میرے پاس بھجوادیا۔ جب ہائی کورٹ نے فیصلہ سنایا اور ان کی ضمانت کی ضبطی اور انھیں اشتہاری مجرم قرار دینے کے احکام نافذ کئے۔ ان کی تفصیل سے تو ہمیں سروکار نہیں لیکن ڈپٹی صاحب جب میرے پاس پہنچے تو وہ میرے لئے خاصے سوہانِ روح ثابت ہوئے۔

ڈپٹی صاحب اس زمانے کے تعلیم یافتہ بوڑھوں کی طرح بالکل دہریہ بلکہ لاادریہ تھے اور مل، ہکسلے، انگرسال وغیرہم کے بڑے دلدادہ۔ میں بچپن سے ان کی بے حد عزت کرتا تھا اور وہ بھی مجھے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ اسی بڑائی کا فائدہ اٹھا کر وہ میری ہر بات پر اعتراض کرتے کبھی نماز کی ہنسی اڑاتے، کبھی دعاؤں کی، کبھی میرے انقلابی پروگرام کی تضحیک کرتے۔ لیکن میں ان تمام باتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا۔ مگر ڈپٹی صاحب نے یاغستان کو بھی ہندستان سمجھا اور ایک دن چند قبائلی سرداروں کے سامنے اپنے عقائد نہایت بے باکی سے بیان کرنے لگے بس، پھر کیا تھا۔ نہ صرف جماعت مجاہدین میں بلکہ ارد گرد کے قبائلی علاقوں میں بھی غم اور غصہ کی لہر دوڑ گئی بڑے مولوی (یعنی راقم) کے پاس ایک ہندستانی ملحد آیا ہوا ہے جو معاذاللہ اسلام، خدائے اسلام اور مسلمانوں کو گالیاں دیتا ہے۔ چنانچہ بعض کٹر ملاؤں نے ان کے قتل کا فتویٰ دیدیا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میرا اثر وہاں بہت زیادہ تھا اور لوگوں کو مجھ سے بے حد عقیدت تھی اور امیر نعمت اللہ بھی بڑے صاحب ثروت تھے کہ یہ آندھی میری کوششوں سے اتر گئی، مگر میں نے پہلی دفعہ ڈپٹی صاحب کو بہت ملامت کی کہ اس طرح کی ناعاقبت اندیشی نہ صرف مذموم ہے بلکہ اس میں میری اور ان کی جان

جانے کا بھی خطرہ ہے۔ خیران کے مباحثے کی داستان تو بہت طویل ہے۔ خدا کی شان کہ ڈپٹی صاحب بہت سخت بیمار ہو گئے۔ ہم نے ان کے لیے پشاور سے ڈاکٹر بلوایا اور علاج وغیرہ میں انتہائی کوشش کی مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اب ڈپٹی صاحب دن رات روتے کہ ہائے میرا خاتمہ اس ویران وادی میں اپنے بیوی بچوں سے دور ہو رہا ہے۔ ایک رات میں نے انھیں سمجھایا کہ خدا پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ آخر آپ میری طرف بھی تو دیکھیے کہ میں اپنی ساری عمر اس سعی بے حاصل میں ضائع کر رہا ہوں لیکن کبھی افسوس نہیں ہوتا۔ اس پر وہ بہت بگڑے اور بہت سی فضول باتیں میرے عقائد کے متعلق اور میرے انقلابی پروگرام کے متعلق کہہ گئے۔ مجھے بھی اس وقت طیش آگیا۔ میں نے کہا کہ ڈپٹی صاحب ہم آپ سے ایک شرط بدتے ہیں۔ آپ دعا کے اثر کے قائل نہیں اور میرا ایمان ہے کہ دعا سے قوموں کی تقدیریں بھی بدلی جا سکتی ہیں۔ اس لئے میں آج رات آپ کی صحت کے لئے دعا کروں گا۔ اگر آپ کو صبح تک شفائے کامل نہ ہو جائے تو آپ کا جو جی چاہے مجھے سزا دیجئے گا' ورنہ آپ اپنے ملحدانہ عقائد سے توبہ کیجیے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ ایک رات آپ بھی میرے ساتھ شریک دعا ہوں''

تہجد کی اذان ہوئی (اسمست میں تہجد کی بھی اذان ہوتی تھی) اور میں بیدار ہوا۔ اُٹھ کر وضو کیا اور ڈپٹی صاحب کو بیدار کیا۔ اُنھوں نے تیمم کیا اور بستر پر لیٹے لیٹے دعا کرنی شروع کی۔ میں نے بھی سجدے میں جبین نیاز رکھدی اور بہت گڑگڑا کر خدا سے دعا کرنی شروع کی کہ ''خدایا! تیرے ایک نہایت ہی گنہگار اور روسیاہ بندے نے محض تیری رحمت پر بھروسہ کر کے اتنی بڑی شرط لگائی ہے۔ تو اسے ذلیل مت کیجیو'' یقین کیجیے کہ میں دعا کرتا جاتا تھا اور میرے دل میں یقین

ہوتا جاتا تھا کہ میری دعا قبول ہو رہی ہے۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب کا بخار اترنا شروع ہوا اور عین اُس وقت جب کہ صبح کی اذان ہو رہی تھی تو میں نے اُٹھ کر ڈپٹی صاحب کا ٹمپریچر لیا تو وہ بفضلہٖ ، ۹۸ ڈگری تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے چلا گیا۔

ڈپٹی صاحب پر اس کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ صبح اُٹھتے ہی اُنھوں نے اپنے عقائد سے توبہ کی اور قرآن شریف کا ترجمہ اور حدیث شریف پڑھنا شروع کی اور بعض ضروری کتب فقہ بھی پڑھیں اور نہایت متشرع اور تہجد گزار مومن ہو گئے۔ گوجرانوالہ میں جب وہ والد صاحب مرحوم و مغفور سے ملے تو انھوں نے نہایت محبت سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "مولوی صاحب! میرے اس بھتیجے نے میری عاقبت کا سامان کر دیا۔"

غرض اس کے بعد ڈپٹی صاحب بالکل ہی بدل گئے تھے۔ وہ ہر بات میں ہم سب کے شریکِ کار رہے اور ہم نے ان کے مشوروں کو بہت مفید پایا۔ اس لئے جب میں پشاور جانے لگا تو انھیں ساتھ لیتا گیا تاکہ ان کی پختہ خیالی میری نوجوانی اور بے فکری کے لئے روک کا کام دے۔

پشاور پہنچ کر پہلے تو صاحبزادہ عبدالقیوم مرحوم سے نہایت مفصل باتیں ہوئیں۔ صاحبزادہ صاحب نہایت ذہین، ہوشمند اور زیرک انسان تھے اور انگریزی ملازمت نے ان کے طبعی خواص کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ سیاست ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھی۔ انگریزی حکومت ان کی بے انتہا عزت کرتی تھی اور شاید حضرت سرسید احمد مرحوم کے بعد کسی مسلم یا غیر مسلم رہنما کو انگریزی دربار میں اس قدر عزت نصیب نہیں ہوئی جتنی کہ صاحبزادہ صاحب کو۔ سرجارج روس کیپل سے لے کر وائسرائے، کمانڈر انچیف بلکہ سکرٹری آف سٹیٹ اور وزیر اعظم انگلستان تک ان کے بلامبالغہ

مرید تھے اور ان کی ہر بات انگریز کے لئے پتھر کی لکیر کا حکم رکھتی تھی۔ میں اپنے ذاتی علم و بصیرت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پچھلی جنگ عظیم میں صاحبزادہ عبدالقیوم ہی کی شخصیت تھی جس نے ہندستان میں انگریزی حکومت کی گرتی ہوئی دیوار کو تھاما۔ درحقیقت کابل سے میرے اخراج کا واحد سبب بھی صاحبزادہ صاحب تھے۔ کیونکہ انہی کے ناخن تدبیر نے پیر صاحب کی خدمات مستعار لی تھیں۔ صاحبزادہ صاحب نہایت شیریں مقال، وسیع النظر شخص تھے مگر افسوس کہ ان کی ساری قابلیت، ذاتی اور خاندانی وجاہت سب کی سب انگریزی راج کی خدمت کے لئے وقف ہو چکی تھیں۔ وہ ددھیال، ننھیال دونوں طرف سے نجیب الطرفین پیروں کی اولاد اکبر تھے اور گورنمنٹ انگریزی نے ان کے اثر سے خوب فائدہ اٹھایا۔ صاحبزادہ صاحب ہماری تحریک کے مؤثر ترین مخالفوں میں سے تھے۔ ان کی ساری زندگی میرے سامنے مثل آئینہ روشن تھی اس لئے مجھ پر ان کا جادو نہ چل سکا۔ انھوں نے مجھے بہتیرے سبز باغ دکھلائے اور سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اپنی زندگی ایک بے کار مشغلہ میں الجھ کر برباد نہ کروں۔ ایک دن میں نے بھی جوش میں آکر اُنھیں خوب ملامت کی اور کہا "کہ صاحبزادہ صاحب! آپ کو خدا نے حسن صورت، حسن سیرت، خاندانی وجاہت، عزت نسب، دنیاوی مال و جاہ، قابلیت و شہرت سبھی نعمتیں عطا کر رکھی ہیں، مگر افسوس کہ بجائے اس کے کہ آپ خدا کا ان نعمتوں پر شکریہ ادا کرتے آپ نے ان تمام فطری قوتوں کو خدا کے دین کی تخریب اور کفر کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ خدا کی خدمت کے لئے اسی تن دہی سے سے کھڑے ہو جاتے جس طرح کہ آپ انگریز کی خدمت کے لئے وقف ہو چکے ہیں۔ تو آپ بھی سید جمال الدین افغانی، سید عبدالقادر الجزائری سید احمد سینوسی، پرنس سعید حلیم پا، انور پاشا کی طرح اسلامی دنیا میں معزز اور ممتاز ہوتے اور مسلمانوں

کے زندہ جاوید رہنا ثابت ہوتے۔ مگر افسوس کہ آپ نے عاجل نفع کو چُن لیا اور دنیا میں منہمک ہو کر عقبیٰ سے بے نیاز ہو گئے۔ کیا آپ کو کبھی خیال نہیں آتا کہ آپ کو خدا کے حضور میں جانا ہے اور اپنے تمام اعمال کا جواب دینا ہے۔" میری تقریر جاری تھی اور صاحبزادہ صاحب کی آنکھوں سے اشک جاری تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان پر میری تقریر کا پائدار اثر ہوا یا عارضی مگر اتنا تو ضرور ہوا کہ وہ جتنی دفعہ بمبئی سے گزرتے میرے ہاں تشریف لاتے اور بار بار کہتے کہ "مولوی صاحب! میرے لئے خدا سے مغفرت کی دعا کیجئے کہ وہ مجھے حشر کے سوا خذے سے بچائے۔"

پشاور میں ہمارے قیام کے تیسرے دن سر جارج روس کیپل چیف کمشنر صوبہ سرحد نے گورنمنٹ ہاؤس میں ہماری دعوت کی۔ کھانے کے بعد سر جارج ہم دونوں کو ایک پرائیویٹ نشست گاہ میں لے گئے۔ صاحبزادہ عبدالقیوم ان کے ساتھ تھے۔ ہم چاروں ایک گول میز پر بیٹھ گئے۔ اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا جو قریباً چار گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس گفتگو کے اکثر حصے مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان کے میرے ذہن میں نقش ہو جانے کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس گفتگو کے بعد میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ دوسرے سر جارج اس کے بعد دو دفعہ بمبئی تشریف لائے اور خاص طور پر مجھ سے ملے۔ ان ملاقاتوں میں بھی وہ اپنے خیالات دہراتے رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک انگریز مبصر کی جو رائے مسلمانوں کے متعلق تھی اسے شرح وبسط سے مسلمانوں کے سامنے پیش کروں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ انگریزی سیاست کا کیا انداز ہے اور ان کی مساعی کے متعلق انگریز مبصرین کی کیا رائے ہے اور وہ سوچیں کہ ہم کدھر بہکے جا رہے ہیں۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ کہ سر جارج کی اکثر آراء سے میں متفق نہ تھا مگر پھر بھی ان کے الفاظ میں ہمارے لئے کافی غور و فکر کا سامان ہے۔ یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس تمام گفتگو کے دوران میں

سر جارج کا روئے سخن اور خطاب صرف میری طرف ہی تھا اور انہوں نے ایک لفظ بھی ڈپٹی صاحب سے مخاطب ہو کر نہ کہا جسے خود ڈپٹی صاحب نے اور میں نے بھی بہت محسوس کیا۔ سر جارج مجھ سے بہت احترام سے گفتگو کرتے رہے اور مولوی صاحب کہہ کر خطاب کرتے رہے۔ گو سر جارج کو پشتو پر تو اہل زبان کی سی قدرت تھی اور اردو اور فارسی بھی خاصی اچھی بولتے تھے مگر مجھ سے ان کی گفتگو انگریزی میں ہوئی۔

سر جارج۔ مولوی صاحب! میں تو اکھڑ آدمی ہوں، لگی لپٹی کہنے کا عادی نہیں ہوں۔ اس لیے میں آپ سے ذرا بے تکلفی سے بات چیت کرنی چاہتا ہوں۔ کہیے اب تو آپ کو یقین ہو گیا ہے یا نہیں کہ آپ کی مساعی بالکل بے نتیجہ اور لاحاصل تھیں اور وہ کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکتی تھیں اور اب تو یہ جنگ بھی ختم ہو رہی ہے اور اتحادیوں کی فتح اور ان کے دشمنوں کی شکست یقینی ہے اور آپ لوگ جنگ کے خاتمہ کے بعد بالکل یتیم ہو جائیں گے۔ اس لئے کیا آپ کے لیے مناسب نہیں کہ اپنی ناکامی تسلیم کر لیں اور گورنمنٹ انگلشیہ جیسی طاقتور حریف سے خواہ مخواہ برسرپیکار نہ رہیں بلکہ صلح کر لیں۔

میں۔ سر جارج! بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ ایک سرکاری مہمان سے اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ اگر میں بھی ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کر دوں تو معاملہ بگڑ جائے گا اور ہماری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اکھاڑہ بن جائے گی۔ مگر میں آپ کے جواب میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر امیر حبیب اللہ سنہری زنجیروں میں نہ جکڑے گئے ہوتے تو آج اس جنگ کی تاریخ ہی دوسری طرح لکھی جاتی اور سر جارج اس قدر فخر و مباہات سے سر اونچا نہ کر سکتے۔ میں نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر کیا تھا اور ایک مکمل منصوبہ کے تحت کیا تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری

اسکیم میں امیر حبیب اللہ خاں نے یہ روڑا اٹکا دیا۔

سر جارج۔ آپ امیر حبیب اللہ خاں کو خواہ مخواہ کوستے ہیں وہ تو نہایت دوراندیش اور عقل مند بادشاہ ہیں اور موجودہ اسلامی دنیا کے بہترین سیاسی لیڈروں میں سے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا انگریزی روپیہ کی وجہ سے نہیں کیا اور نہ ہم نے انھیں روپیہ دیا بلکہ محض ملک کی خیر خواہی کے لئے کیا۔ خیر۔ اب آپ بتائیے کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ کا خواب کہ سارے ہندوستان میں ایک اسلامی حکومت قائم کی جائے شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا اور آپ ہم سے لڑکر پتھر سے سر پھوڑیں گے۔

میں۔ سر جارج! یہ تو میرا ایمان ہے کہ نہ صرف ہندستان پر بلکہ تمام دنیا پر ایک نہ ایک دن اسلام کا جھنڈا لہرائے گا۔ اس لئے ہر مسلم کا فرض ہے کہ وہ اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دے اور آپ جانتے ہیں کہ ایمان و یقین محض عقل کے تابع نہیں ہوا کرتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایمان انسان کو ایک قدم آٹھانے پر مجبور کرتا ہے پھر عقل اس کی کامیابی کے اسباب فراہم کرتی ہے۔ آپ اس بحث کو جانے دیجئے کہ میرا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے یا نہیں کیونکہ میں تو خدا سے عہد کر چکا ہوں کہ جب تک میرے جسم میں جان ہے میں اسلام کی سربلندی کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا' لیکن میں اتنا اب بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہماری حقیر مساعی نے روپیہ کی قلت کے باوجود آپ کے کروڑوں روپیہ سالانہ کے خرچ کو بالکل بیکار کر دیا اور اسلام میں اب بھی اتنی قوت ہے کہ وہ اس بے سرسامانی کی حالت میں بھی کفر کی سب سے بڑی سلطنت سے ٹکرا سکتا ہے۔ مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ اس بحث میں الجھے بغیر بتلایئے کہ آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے؟

سر جارج۔ میرا مقصد تو یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ ایسا ذہین اور

قابل شخص اپنی زندگی پہاڑوں میں برباد کر دے۔ اب آپ کا فوری کام تو ختم ہو چکا ہے کیونکہ نہ تو آپ امیر افغانستان کو تیار کر سکے کہ وہ ہم پر چڑھائی کریں اور نہ آپ ہندستان میں ہندو کو بغاوت پر تیار کر سکے۔ جنگ کا خاتمہ اب قریب ہے اور اس میں ہماری فتح یقینی ہے لہذا آپ کے لئے اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا کہ آپ بجائے پتھروں سے سر پھوڑنے کے ہندوستان آجائیں اور اپنی فطری صلاحیتوں سے کام لیں۔

میں۔ میں آپ کی ہمدردی کا ممنون ہوں مگر آپ کو معلوم ہے کہ میں اس تحریک میں تنہا نہیں ہوں۔

سر جارج۔ ہاں میں خوب جانتا ہوں کہ آپ کی جماعت نہ صرف یاغستان میں ہے بلکہ ہندستان میں بھی بہت سے باغی ہیں جو آپ کے شریک کار ہیں گو ابھی تک ہم انھیں پکڑ نہیں سکے۔ آپ بڑے شوق سے اپنی یاغستانی مجلس شوریٰ سے مشورہ کر لیجئے اور اگر ضرورت ہو تو ہندستان میں بھی کانگریسی لیڈروں سے اور اپنے والد صاحب سے مشورہ کر لیجئے۔

میں۔ بفرض محال مشورہ کے بعد اگر یہی طے پایا کہ میں انڈین گورنمنٹ کی اس پیش کش کو قبول کر لوں تو میرے ساتھیوں کا کیا حشر ہوگا؟

سر جارج۔ آپ کے ساتھیوں میں سے ملا بشیر، مولوی محمد موسیٰ اور مہاجر لڑکے وغیرہم کو تو میں ہندستان واپس آنے کی اجازت دے دوں گا، لیکن ڈپٹی برکت علی، مولوی ولی اللہ قصوری، مولوی عبد الوہاب سندھی کو معافی نہیں مل سکتی کیونکہ وہ اشتہاری مجرم اور قانوناً مفرور اور سزا یافتہ ہیں۔

میں۔ کیوں، میں بھی تو اشتہاری مجرم ہوں بلکہ میرے سر پر تو انعام بھی مقرر ہے۔

سرجارج۔ یہ ٹھیک ہے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ آپ سزا یافتہ نہیں اور فرنٹیر نظامِ حکومت میں مجھے غیر محدود اختیارات ہیں۔ میری سفارش کو گورنمنٹ آف انڈیا کبھی مسترد نہیں کر سکتی، لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ کے بارے میں بھی جنگ کے خاتمہ کے بعد بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

میں۔ تو آپ فرنٹیر اختیارات کو استعمال کر کے ڈپٹی برکت علی اور مولوی ولی اللہ اور مولوی عبدالوہاب کو بھی معافی دے سکتے ہیں۔

سرجارج۔ نہیں۔ ان کی پوزیشن مختلف ہے۔ ڈپٹی برکت علی کو ہائی کورٹ نے سزا دی ہے۔ مولوی ولی اللہ کو فرید کوٹ ہائی کورٹ نے اور مولوی عبدالوہاب کو سندھ ہائی کورٹ نے۔ اس لئے اِن فیصلوں کو میں کسی طرح بھی مسترد یا کالعدم نہیں قرار دے سکتا۔

میں۔ وائسرائے تو اپنے شاہی اختیارات سے اِن سزاؤں کو منسوخ (Commute) کر سکتے ہیں۔

سرجارج۔ جہاں تک مجھے علم ہے وائسرائے سر مائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب کے مشورے کے بغیر اپنے اختیارات کو محض میری سفارش پر استعمال نہیں کریں گے اور سر مائیکل نہایت سخت ضدی آدمی ہیں۔ وہ کبھی بھی اس پر راضی نہیں ہوں گے۔ وہ اسے سرکار انگریزی کی توہین خیال کریں گے۔ جب میں نے گورنمنٹ آف انڈیا میں آپ کے متعلق تحریک کی تو سر مائیکل نے آپ کی واپسی کی سخت مخالفت کی مگر چونکہ آپ کا ریکارڈ بہت شاندار تھا اور انگریزی گورنمنٹ چونکہ بہادر ہے اس لئے ایک بہادر دشمن کی عزت بھی کرنا جانتی ہے۔ اس لیے میں نے زور دے کر گورنمنٹ آف انڈیا اور سکرٹری آف اسٹیٹ سے منوا لیا کہ مولوی محمد علی کا یاغستان سے چلے آنا اس وقت فرنٹیر کے امن کے لئے ضروری ہے

چنانچہ سر ہائیکل کو بھی بالآخر رضامند ہونا پڑا اور میں نے محض اس خیال سے کہ شاید آپ مشورہ کے لئے پنجاب جانا چاہیں، گورنمنٹ آف انڈیا سے اجازت منگوالی ہے کہ آپ کو دہلی تک جانے کی اجازت ہے۔ آپ کل صبح مجھے بتلا دیں تو میں لاہور کے ڈپٹی کمشنر کے نام قصور کے ایس۔ ڈی۔ او۔ اور کپتان پولیس کے نام تار کر دوں گا اور آپ کے لئے فرنٹیئر میل میں ڈبہ ریزرو کرا دوں گا تاکہ آپ بغیر کسی مزاحمت کے وہاں جاکر مشورہ کر سکیں۔ پنجاب کے قیام کے دوران میں آپ پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی مگر آپ سے مجھے اتنی توقع ضرور ہے کہ کسی پبلک جلسہ میں آپ تقریر نہیں کریں گے۔ آپ جب تک آپ کا جی چاہے وہاں قیام کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد ہم واپس اپنی قیام گاہ پر لوٹ آئے۔ صاحب زادہ صاحب ہمارے ساتھ تھے۔ جب میں اور ڈپٹی برکت علی صاحب کمرے میں الگ ہو کر بیٹھے تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ڈپٹی صاحب رو رہے ہیں۔ میں نے پوچھا تو فرمانے لگے کہ تم تو آزاد ہو گئے اور ہم اس بڑھاپے میں خوار ہونے کے لئے اکیلے رہ جائیں گے۔ تمھارے ساتھ دل بستگی تھی سو تم بھی ہمارا ساتھ چھوڑ رہے ہو۔ میں نے کہا ڈپٹی صاحب آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ میں انشاء اللہ آپ کی رہائی کے لیے پوری کوشش کروں گا۔

شام کے کھانے پر صاحب زادہ صاحب سے بڑی مفصل گفتگو ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ مولوی صاحب میری دیانت دارانہ رائے یہی ہے کہ آپ کو سر جارج کی پیش کش کو فی الفور قبول کر لینا چاہئے۔ کیونکہ اگر جنگ ختم ہوگئی تو پھر آپ کی فوری واپسی کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ میں نے کہا کہ میں تو ابھی واپسی کے لئے اس قدر تیار نہیں البتہ اگر ڈپٹی برکت علی صاحب کی واپسی کا انتظام ہو جائے

تو بہت اچھا ہوگا۔ صاحبزادہ صاحب نے کہا کہ یہ بہت مشکل ہے، لیکن آپ کا پنجاب جانے کے متعلق کیا خیال ہے۔ میں نے کہا کہ صبح عرض کروں گا۔

رات کو بہت دیر تک میں اور ڈپٹی صاحب مصروفِ گفتگو رہے۔ ڈپٹی صاحب کو اصرار تھا کہ مجھے یہ زرّیں موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیئے اور انھیں یقین تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا مجھ سے اس قدر خائف ہے کہ اگر میں زور دوں گا تو وہ ان کی رہائی پر بھی رضامند ہو جائے گی۔ صبح کو ناشتے پر میں نے صاحبزادہ صاحب سے کہہ دیا کہ میں پنجاب جاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے اسی وقت سر جارج کو فون کرکے میری روانگی کا انتظام کر دیا اور میں دوسرے دن فرنٹیر میل میں سوار ہو کر لاہور روانہ ہوا۔ میرے ساتھ ایک انگریز پولیس افسر سادہ لباس میں سفر کر رہا تھا۔

میرے قصور پہنچنے کی خبر قصور کے ایس۔ ڈی۔ او۔ مسٹر متر نے والد صاحب مرحوم کو پہنچا دی تھی۔ چناں چہ وہ خبر تمام شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ فرنٹیر میل چونکہ ان دنوں رات کے گیارہ بجے قصور سے گزرتا تھا اس لئے میں رات لاہور ٹھہر گیا اور دوسرے دن صبح کی گاڑی پر سوار ہو کر قصور روانہ ہو گیا۔ وہ انگریز افسر برابر میرے ساتھ تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ تمام راستہ بھر نہ تو اُس نے مجھ سے بات کی اور نہ مجھے یہ شبہ ہونے دیا کہ وہ میری نگرانی کے لئے مقرر ہے۔ قصور پہنچ کر میں نے دیکھا کہ پلیٹ فارم شائقین سے بھرا ہوا ہے اور لوگوں نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ کپتان پولیس بھی اسٹیشن پر موجود تھے۔ اس انگریز افسر نے ان سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ اب یہ آپ کے چارج میں ہیں اور وہ خود چلا گیا۔ قصور میں میرے آنے کی خوشی میں تمام سکول بند کر دیئے گئے اور

تمام دن لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔

دوسرے دن سے نہ صرف میرے اعزا و اقربا بلکہ میرے دوست احباب دُور دُور سے ملنے کے لئے آنے شروع ہو گئے۔ کئی دن تک تو حضرت قبلہ والد صاحب مرحوم سے مشورے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بالآخر ان سے مفصل بات چیت ہوئی تو ان کی یہ رائے ہوئی کہ اب ہندستان میں رہ کر کام کرنے کا موقع ہے اس لئے اس پیشکش سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس کے بعد میں نے رانچی مولانا آزاد کے پاس ' چھندواڑہ۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے پاس اور دہلی حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی خدمت میں خاص معتمدین مشورے کے لیے روانہ کیے۔ سب کی یہی رائے تھی کہ اب ہندستان آکر کام کرنے کا وقت ہے۔ اب ہندستان سے باہر رہ کر چنداں مفید کام نہیں ہو سکتا۔ اس دوران میں میں دہلی بھی گیا اور وہاں پہلی مرتبہ بابائے اُردو جناب مولوی عبدالحق صاحب سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ ان کے ایماء پر میں حیدرآباد بھی ملازمت کے لیے قسمت آزمائی کرنے گیا، مگر حیدرآباد میں میرے جیسے باغی کے لئے کہاں جگہ تھی۔ خیر یہ طویل قصہ ہے۔ میں ہفتہ عشرہ اپنے بھائی مولوی محی الدین احمد صاحب کے ہاں بھی دسوہیہ ' ضلع ہوشیارپور (مشرقی پنجاب) میں جاکر ٹھہرا۔ وہ ان دنوں دسوہیہ میں نظر بند تھے۔ ان کی رائے بھی دوسرے بزرگوں کی رائے سے متفق تھی۔

قصہ مختصر میں کافی مدت قیام کے بعد واپس پشاور پہنچا۔ وہاں ڈپٹی برکت علی صاحب میرے منتظر تھے۔ سر جارج نے اب کی مرتبہ مجھے تنہا دعوت دی۔ صرف صاحبزادہ صاحب موجود تھے۔ اب انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں گورنمنٹ انگریزی کی پیشکش قبول کرتا ہوں مگر ایک شرط ہے کہ کم از کم ڈپٹی برکت علی کو میرے ساتھ آزادی دی جائے۔ مگر آخری فیصلہ کرنے سے

پہلے میں یاغستان واپس جاکر اپنے احباب سے مشورہ ضرور کروں گا۔ سرجارج نے کہا کہ بے شک تم یاغستان جاکر مشورہ کرلو مگر ڈپٹی برکت علی کی شرط کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔ ان سے رخصت ہوکر میں اور ڈپٹی صاحب صاحبزادہ صاحب کے ایک معتمد کے ساتھ سرحد پار ہوگئے اور واپس اسمست پہنچ گئے۔

اسمست میں سب احباب جمع تھے۔ جب میں نے ان سے ہندستانی بزرگوں کی رائے کا ذکر کیا تو ان سب پر اوس پڑ گئی۔ وہ میری جدائی کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ سب سے زیادہ قلق ملا بشیر مرحوم کو تھا کیونکہ ہم دونوں اس تمام تحریک کی روحِ رواں تھے۔ تین چار دن کی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ میں متوکلاً علی اللہ ہندستان چلا جاؤں مگر اس انقلابی تحریک کی زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں ہی رکھوں اور ہندستان کے شرکائے کار کے تعاون سے ہندستان میں انقلابی تحریک کے لیے سازگار فضا پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ یہ بھی طے پایا کہ افغانستان میں انقلاب پیدا کرنے اور جماعتِ مجاہدین کی اصلاح کی تحریک کو بدستور جاری رکھا جائے۔

قبائلی علاقے میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ میں ہندستان واپس جارہا ہوں۔ چنانچہ اکثر علاقوں سے میرے پاس وفود آئے۔ ان میں سے اکثر کی یہ رائے تھی کہ میں ہندستان نہ جاؤں بلکہ وہیں کسی عمدہ علاقے میں شادی کرکے بس جاؤں اور ان لوگوں کی تنظیم کا کام اپنے ہاتھ میں لوں۔ مگر میں نے انھیں سمجھایا کہ جب تک ہندستان آزاد نہ ہو قبائلی تنظیم چنداں مفید نہیں ہوسکتی۔ میں ہر وفد کو ہدایت دے کر رخصت کرتا رہا۔ اس میں تین ماہ سے زائد صرف ہوگئے۔

اتنے میں شاید دو تین واقعات رونما ہوگئے۔ جن کی صحیح تاریخیں یاد نہ ہونے

کے باعث میں ان کی تقدیم و تاخیر کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ پہلا واقعہ تو یہ ہوا کہ صاحبزادہ صاحب کا خاص آدمی آیا اور کہا کہ سر جارج روس کیپل گورنمنٹ آف انڈیا کو منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ ڈپٹی برکت علی کو بھی واپسی کی مشروط اجازت دے۔ مگر شرائط اسی وقت بتلائی جائیں گی جب تم یہاں آجاؤ گے اور اگر تم آنا چاہتے ہو تو فی الفور بلا تاخیر آجاؤ ورنہ سر مائیکل اوڈوائر کو کھنڈت ڈالنے کا موقعہ مل جائے گا۔ اس پیغام کے پہنچنے کے بعد میں بالکل تیار ہو گیا۔ ایک جمعہ کو خطبہ میں میں نے تمام جماعت مجاہدین سے اور بہت سے قبائلی خوانین سے رخصتانہ خطاب کیا۔ خوش قسمتی سے میں نے اس خطاب کا خلاصہ اپنی تفسیر کے آخر میں لکھ لیا تھا اور اس وقت اس تفسیر کو ملا بشیر کے حوالہ کر آیا تھا۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں میرے محترم رفیق مولانا فضل الٰہی مرحوم اس کتاب کو واپس لے آئے اور اب وہ میرے پاس ہے۔ آگے چل کر میں اس طویل خطبہ کے بعض اقتباسات ہدیۂ ناظرین کروں گا تاکہ انھیں معلوم ہو سکے کہ اس وقت میری قلبی کیفیت کیا تھی اور آیندہ کے لیے میں کیا کیا عزائم لیکر ہندستان پہنچا تھا۔ دوسرا واقعہ جو غالباً اہمت سے واپسی پر پیش آیا وہ یہ تھا کہ نومبر ۱۹۱۸ء میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ترکی نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور انگریزی فوجیں قسطنطنیہ (سابق دارالسلطنت ترکی) میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس خبر نے مجھ پر بجلی کا سا اثر کیا۔ میرے تمام اعضا شل ہو گئے۔ رہی سہی امیدوں پر پانی پھر گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ میں نے اپنی تمام عمر برباد کر لی۔ مگر حدیث شریف کے حکم کے مطابق دو رکعت نماز کی نیت باندھی اور خدا سے دعا مانگنی شروع کی۔ اس نماز میں مجھ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں اس کے بعد میں سو گیا۔ کوئی چار بجے صبح کا وقت ہوگا کہ یک لخت میری آنکھ کھل گئی۔ نہایت سہانا وقت

تھا۔ پرندے چہچہا رہے تھے اور ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ اچانک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ تمام عالم بقعۂ نور بن گیا ہے۔ اب آواز آنی شروع ہوئی "خاموش! خاموش! اللہ میاں تقریر فرماتے ہیں"۔ اب تقریر شروع ہوئی۔ "اے میرے مسلمان بندو! تم کیوں روتے ہو۔ تمھارے رونے سے ہمیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ہماری درگاہ میں مایوسی سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔ ہم نے یوسف کو کنوئیں میں ڈالا۔ اس لیے نہیں کہ ہم اُسے اس وقت بچا نہیں سکتے تھے، نہیں، بلکہ اس لیے کہ تیس سال بعد اسے تختِ خلافت پر متمکن کر دیں۔ تمہارا کام جان دینا ہے سوال کرنا نہیں۔ ہماری درگاہ میں مایوسی سے بڑا کوئی گناہ نہیں"۔ تقریر ختم ہیں وہ تمام نور ظہور ختم ہو گیا۔ صبح صادق کا وقت ہو گیا۔ پرندے چہچہانے لگے اور میرا قلب اس وقت عجیب اطمینان سے معمور ہو گیا۔ اس واقعہ کی ٹھنڈک میں اب تک اپنے قلب میں محسوس کرتا ہوں۔

آمدم برسرِ مطلب۔ میری رخصت کا وقت آن پہنچا۔ جامع مسجد اسمست میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ میں جب الوداعی تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو میرا بدن جذبات کی شدّت سے کانپ رہا تھا۔ میری آنکھیں پُرنم تھیں۔ ایک ایک کر کے تمام واقعات میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ میرا افغانستان سے فرار، دشوار گزار راستوں سے گزر کر کنڑ پہنچا اور چمرکنڈ داخل ہونا، جہاد کے ولولے، انگریزی حکومت کو زیر و زبر کر دینے کے منصوبے، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب، قبائلیوں کی محبّت و عقیدت، ملا صاحبان کی شفقت و مہربانی بالآخر میں نے اپنے تئیں سنبھالا اور خطاب شروع کیا۔

"برادرانِ من! آج میری زندگی کا بہت المناک واقعہ ظہور پذیر ہو رہا ہے یعنی میں آپ سے رخصت ہو رہا ہوں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ میں کیا کیا ارادے

لے کر اس سرزمین میں داخل ہوا تھا اور ان ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے آپ لوگوں کی اعانت سے کیا کیا جتن نہیں کیئے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو ابھی منظور نہیں تھا کہ ہمارے خواب شرمندۂ تعبیر ہوں اور اب حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی بنا پر ہماری جماعت نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اب ہندستان میں کام کریں اور انگریزی حکومت کو اندرونی شورش سے ہلا دیں۔ اس لئے میں آپ سے رخصت ہو رہا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میں نے اپنی شکست کو تسلیم کر لیا ہے، بلکہ اس لیے کہ اب محاذ جنگ کا نقشہ بدل گیا ہے۔ میں جس طرح پہلے اسلام کا ادنیٰ سپاہی تھا آیندہ بھی تمام عمر انشاء اللہ ویسا ہی جاں نثار سپاہی رہوں گا۔ میرا آپ سے انشا اللہ بڑا گہرا تعلق رہے گا اور میں آپ کے ہر اقدام میں براہِ راست دلچسپی لیتا رہوں گا۔

"برادرانِ من! سب سے پہلے تو میں آپ کی محبّت اور مسافر دوستی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میں یکہ و تنہا آپ کے ہاں آیا اور آپ نے میری اس قدر عزّت کی کہ مجھے سر پر بٹھایا۔ میں سپاہی کے طور پر آیا تھا اور آپ نے مجھے اپنا سردار تسلیم کیا۔ آپ کی محبّت کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ دو ایک باتیں آیندہ کے کام کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔

"آپ کو معلوم ہے کہ حضرت سیّد احمد صاحب بریلوی نے یہ تحریک جہاد محض اس لئے شروع کی تھی کہ انگریزوں کو ہندستان سے نکال کر وہاں اسلامی سلطنت علیٰ منہاج الخلافۃ قائم کی جائے اور پھر ہندستان کو تمام عالم کی اصلاح کے لئے مرکزی خطہ قرار دیکر تمام دنیا میں اللہ کی حکومت قائم کی جائے۔ حضرت سیّد صاحب کا مشن یہ تھا کہ دنیا سے جور و ظلم، فسق و فجور، بدامنی اور فساد اور جہالت و بدعت کو مٹا کر اسے عدل و انصاف، نیکی و راستبازی، امن و اخوت

علم و بصیرت سے معمور کر دیا جائے اور اس مشن کی تکمیل میں انھوں نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس کے بعد ان کے بہادر اخلاف نے انگریز کے خلاف جہاد کی مہم کو جاری رکھا اور جنگ آزادی کے جھنڈے کو سرنگوں نہ ہونے دیا، لیکن افسوس کہ ان کے اس نیک کام کو ہم لوگوں نے بھلا دیا اور ایک موہوم خیال کی پرستش کرنی شروع کی، اور وہ یہ کہ حضرت سیّد صاحب شہید نہیں ہوئے بلکہ وہ زندہ ہیں اور وہ دوبارہ ظہور کر کے ہند کو کفر کے تسلّط سے نجات دلائیں گے۔ یہ عقیدہ بالکل فاسد اور باطل ہے۔ میں نے حتی الوسع اپنے قیام کے دوران میں اس عقیدہ کی تردید کی ہے۔ اب پھر کہتا ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ حضرت سیّد احمد ثانی بن جائے۔ اور اسلام کا جھنڈا ہاتھ میں لیکر دنیا کو عدل و انصاف سے معمور کرنے، جمود و ناالضافی کو مٹانے، علم و بصیرت کی روشنی کو پھیلانے اور جہالت اور بدعت کو فنا کرنے، نور ہدایت کو عام کرنے اور توہم پرستی کی خرافات کو فنا کرنے کے لئے اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

اٹھو! میرے بھائیو! اٹھو۔ تم خدا کے سپاہی ہو۔ تم حزب اللہ ہو۔ اٹھو! اور دنیا کو دکھا دو کہ خدا کے سپاہی کیوں کر رحمتِ مجسّم بن کر رحمۃ للعٰلمین کا پیام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچاتے ہیں۔ اٹھو! ہمارے اسلاف کے زرین کارنامے، ان کی عدیم المثال قربانیاں، ان کی خدمتِ خلق کے جذبات آپ کو دعوت دے رہے ہیں کہ تم بھی خدا کے بن جاؤ تو خدا بھی تمہارا

بن جائیگا۔

ان تنصروا اللہ ینصرکم و یثبت اقدامکم

(اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے
قدموں کو مضبوط کر دے گا)

"اُٹھو! فتح و نصرت ہماری ہے۔ دنیا کی سیادت ہماری ہے۔۔۔۔۔۔ وغیرہ" یہ تقریر بہت لمبی تھی۔ میں نے اس کے چند کلمے پیش کر دیے ہیں۔ اس کے بعد میں سب احباب سے بغل گیر ہو کر رخصت ہوا اور گھوڑے پر سوار ہو کر سرحد کی طرف روانہ ہوا۔ میری آنکھیں اشکبار تھیں۔ میرے قدم بھاری ہو رہے تھے اور دل اس خیال سے کہ شاید یہ جدائی دائمی ہو بیٹھا جا رہا تھا۔

پشاور پہنچ کر میں اور ڈپٹی برکت علی صاحب صاحبزادہ عبدالقیوم خاں کے ہاں مقیم ہوئے۔ دوسرے دن ہم تینوں سر جارج روس کیپل کے ہاں کھانے پر گئے، کھانے کے بعد انھوں نے پہلے تو فرمایا کہ مولوی صاحب! محض آپ کی ضد کی وجہ سے میں نے گورنمنٹ آف انڈیا پر زور دیا کہ ڈپٹی برکت علی کی سزا کو بھی شاہی اختیارات سے منسوخ (Commute) کر دیا جائے، لیکن سر مائیکل اوڈ وائر نے اتنی سخت مخالفت کی کہ مجھے اندیشہ ہو گیا کہ کہیں آپ کی واپسی کا معاملہ بھی کھٹائی میں نہ پڑ جائے۔ لیکن میں نے گورنمنٹ آف انڈیا اور سکریٹری آف سٹیٹ کو یقین دلایا کہ آپ کا ہندستان آجانا ہمارے لیے بہت مفید ہے۔ اسی لیے وائسرائے نے ڈپٹی برکت علی کے لیے مندرجۂ ذیل شرائط پر واپسی کی اجازت دیدی ہے۔

اوّل۔ ان کی جلا وطنی کو قید میں محسوب کر لیا جائے اور ان کی ضمانت

کی ضبطی کا حکم منسوخ کر دیا جائے۔

دویم۔ آیندہ بھی جب تک ان کی قید کی میعاد ختم نہ ہو جائے یہ پنجاب نہ جائیں بلکہ مانسہرہ میں میری حکومت میں ٹھہریں۔ انھیں اپنے اہل و عیال کو بلا کر ساتھ رکھنے کی اجازت ہوگی۔ ان پر کسی قسم کی پابندی نہ ہوگی اور نہ ہی ان کی ڈاک وغیرہ سنسر ہوگی۔ مانسہرہ میں میں نے ان کے لئے ایک ہوادار مکان تجویز کر دیا ہے۔

سویم۔ ہم انھیں کوئی وظیفہ نہ دیں گے۔ مگر اس خیال سے کہ یہ اپنا گزارہ چلا سکیں ان کے بڑے بیٹے کو جو پنجاب میں ہیڈماسٹر ہیں، مانسہرہ میں ہیڈ ماسٹر بنا دیں گے اور ان کو وہی تنخواہ دیں گے بلکہ فرنٹیر الاؤنس بھی دیں گے۔

اس کے بعد انھوں نے صاحبزادہ کو اشارہ کیا اور وہ ڈپٹی برکت علی صاحب کو لے کر چلے گئے۔ پھر انھوں نے مجھے دو سو اشرفی طلائی کی تھیلی پیش کی اور کہا کہ یہ سرکار انگریزی کی طرف سے آپ کی مہمانی ہے۔ میں نے بہت انکار کیا مگر انھوں نے کہا کہ نہیں یہ ہمارا دستور ہے اور آپ اسے مسترد نہ کریں۔

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ "مولوی صاحب! میں آپ کی تمام مساعی کو دیکھتا رہا ہوں اور میں نے گورنمنٹ انگریزی سے اس امر کی منظوری لے لی ہے کہ آپ کو کوئی نہایت عمدہ عہدہ دیا جائے تاکہ آپ کی قابلیت ضائع نہ ہو۔"

میں۔ "مجھے سرکاری خدمت سے معذور ہی رکھیے۔"

سر جارج۔ (مسکرا کر) "کیوں ابھی تک آپ کے دماغ میں اسلامی حکومت کے قیام کا خیال بسا ہوا ہے؟"

میں:" یہ خیال تو میرے رگ و ریشے میں پیوست ہو چکا ہے۔ میں کسی صورت میں بھی انگریزی ملازمت قبول نہیں کرسکتا۔"

سر جارج:" مجھے بہت افسوس ہو گا کہ آپ ایسا ہونہار نوجوان اپنی قابلیت اور عمر ایک بیکار خیال کی تحصیل کے لیے ضائع کرے۔ میں یہ آپ کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ میری آفر مسترد کر کے آپ صرف اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ سرکاری رہنمائی سے آپ ہندوستانی مسلمانوں کے دوسرے سر سید احمد خاں بن سکتے ہیں۔"

میں:" میں آپ کی عنایت کا بہت مشکور ہوں لیکن میں ہندوستانی مسلمانوں کا دوسرا سر سید بننے کی بجائے دوسرا سید احمد بریلوی یا اسمٰعیل شہید بننا چاہتا ہوں۔"

سر جارج۔ (مسکرا کر)" اس خیال کو دل سے نکال دیجئے۔ انگریزی حکومت ایسی دور اندیش اور عقلمند ہے اور مسلمان من حیث القوم اس قدر بے وقوف اور آسانی سے خریدے جا سکتے ہیں کہ کبھی بھی ان کے رہنماؤں کو خریدنے میں دقت پیش نہیں آئی۔ اگر ہمیں مولوی محمد علی نہیں مل سکتا تو کوئی اور محمد علی مل جائیں گے۔ اور یہ میں آپ کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان ایسی سادہ لوح قوم ہے کہ وہ اپنے اصل رہنماؤں کی پیروی کی بجائے ہمارے منتخب کردہ یا نامزد کردہ رہنماؤں کی دیوانہ وار پیروی کریں گے۔ ان کی تاریخ بھی ثابت کرتی ہے کہ وہ اپنے رہنماؤں کی پیروی نہیں کرتے، پرستش کرتے ہیں۔ اور جو قوم اپنے رہنماؤں کی پرستش کرتی ہے وہ اُن کی غلطیوں کو نہ صرف نظر انداز کرتی ہے بلکہ انھیں بھی محاسن میں شمار کرتی ہے۔ مولوی صاحب! ذرا سوچئے کہ ہم نے کیونکر مسلمانوں کے اپنی علما و مشائخ کی مدد سے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کو فنا کر دیا۔ ہندستان میں سید احمد صاحب بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی تحریک کو ملیا میٹ

کر دیا۔ ٹرکی اور ایران میں سید جمال الدین افغانی اور مدحت پاشا کی تحریک کو کچل دیا اور یہ سب کام آپ کے اپنے علما و مشائخ اور رہنماؤں نے کیا۔ آپ بھی اگر سرکارِ انگریزی کے خلاف چلیں گے تو آپ کا بھی وہی حشر ہو گا جو آپ سے پیشتر انگریزی استعمار کے دشمنوں کا ہوا۔ میں پھر آپ سے کہتا ہوں کہ ہم آپ کو بڑی سے بڑی ملازمت پیش کر سکتے ہیں تاکہ آپ کی قابلیت اور چمکے اور آپ دنیائے اسلام کی ممتاز ترین ہستیوں میں شمار ہونے لگیں۔"

میں: "مجھے معاف ہی رکھئے۔"

سرجارج: "اچھا، میں ایک بات اور آپ سے کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ اپنی یاغستانی مہموں اور جماعت مجاہدین کے پوست کندہ حالات لکھ دیجئے۔ میں خود انھیں ایڈٹ کروں گا اور گورنمنٹ انگریزی اپنے خرچ پر انھیں چھپوائے گی اور میرا خیال ہے کہ آپ کو کم از کم ایک لاکھ روپیہ بطور رائیلٹی گورنمنٹ انگریزی سے دلوا دوں گا۔"

میں: "شکریہ۔

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ آن است
بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

یہ حالات تو میرے سینے میں ہی رہیں گے۔ ہاں جب گورنمنٹ انگریزی ہند سے چلی جائے گی تب یہ صفحۂ قرطاس پر شاید آئیں۔"

سرجارج: "مجھے افسوس ہے کہ آپ اتنی مفید معلومات کو اپنے سینے میں ہی دفن کئے رکھیں گے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ کی زندگی میں تو برٹش حکومت ہندستان کو خالی نہیں کرے گی۔"

غرض بہت طویل گفتگو کے بعد میں رخصت ہو کر صاحبزادہ عبدالقیوم

خاں کے مکان پر چلا آیا۔ میرے آنے کے کوئی پانچ منٹ بعد مہر جارج کا ایڈی کانگ اشرفیوں کی تھیلی لے کر آیا کہ مولوی صاحب آپ بھول آئے تھے، ڈپٹی برکت علی کے اصرار پر میں نے تھیلی رکھ لی اور جب صاحبزادہ صاحب چلے گئے تو میں نے وہ تھیلی ڈپٹی صاحب کی نذر کر دی اور کہا کہ یہ لیجئے آپ کا دو سال کا خرچ آ گیا۔

اس کے بعد میں شاید دو تین دن پشاور میں ٹھہرا۔ اس دوران میں مجھے صاحبزادہ صاحب نے پشاور اسلامیہ کالج میں ڈنر دیا۔ ڈنر کے بعد میری تقریر ہوئی جس کا عنوان تھا "مسلمان لڑکوں کا نصب العین"، پشاور کالج کے متعلق مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے مجھ سے میرے تاثرات دریافت کیے اور میں نے یہ شعر پڑھا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

بالآخر سر جارج رُوس کیپل نے مجھے بلا کر کہا کہ گورنمنٹ آف انڈیا سے آپ کی روانگی کی منظوری آ گئی ہے اور آپ اب جا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں واپس قصور آ گیا۔

قصور میں اس وقت بڑے سخت ہنگامے ہو رہے تھے اور گاندھی جی کی پلول پر گرفتاری کے سبب کئی انگریز ہندستانی غصے کا شکار ہو چکے تھے چنانچہ انگریز نے بھی نہایت سخت انتقامی کارروائی کرنے اور اہلِ پنجاب کو سبق سکھانے کا تہیہ کر لیا تھا، اور قصور، لاہور، گوجرانوالہ، امرتسر وغیرہ میں مارشل لا کا اعلان کر کے ہر صاحب اثر ہندستانی کو گرفتار کر لیا تھا اور ان کے خلاف جھوٹی شہادتیں بنا کر ان پر بغاوت کے سنگین مقدمے قائم کر دیئے

تھے۔ قصور میں بھی ریلوے اسٹیشن پر چھ سولیاں گاڑی گئی تھیں اور کیپٹن ڈوٹن (Cap. Dovetot.) قصور کے ایریا کمانڈر تھے۔ ان کا حکم تھا کہ شہر قصور کی تمام مرد آبادی روزانہ مارچ کر کے ان سولیوں کے گرد جمع ہو۔ جب سب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو کیپٹن صاحب ایک عدد تقریر ارشاد فرماتے تھے جو قریباً ایک ہی ہوتی تھی۔ وہ تقریر مجھے اب تک یاد ہے۔

"ٹم ہنڈوسٹانی لوگ کتا ہے۔ ٹم نے ٹمن صاحب لوگ اور میم صاحب لوگ قتل کر دیا ہے۔ ہم ٹم میں سے ٹین سو کتوں کو سولی پر لٹکائے گا۔

اس دوران میں سر مائیکل اوڈوائر کے حکم سے مجھے، میرے والد محترم اور بڑے بھائی صاحب کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور ہمارے خلاف ایک قلی کو یہ شہادت دینے پر مجبور کیا گیا کہ یہ دونوں بھائی اپنے باپ کے حکم سے تاروں کے کھمبوں پر چڑھے ہوئے تھے اور کاٹ رہے تھے۔ یہ اتنا بڑا سفید جھوٹ تھا کہ بے چارے مسٹر مٹر (ایس۔ ڈی۔ او) اور احمد حسین خاں مرحوم (کپتان پولیس) دونوں نے اس پر احتجاج کیا کہ محمد علی کی تو باقاعدہ ڈائری رکھی جاتی تھی یہ ان دنوں قصور میں موجود ہی نہ تھا۔ یہ مقدمہ کیوں کر چل سکے گا۔ خیر۔ بصد مشکل مجھے تو چھوڑ دیا گیا اور والد صاحب قبلہ کو اور بھائی صاحب مولوی محی الدین احمد کو جیل میں بند کر دیا گیا۔

مارشل لا کی سختیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور گورنمنٹ انگریزی انتہائی تشدد پر اتر آئی تھی کہ ایک معجزہ رونما ہوا۔ میرے پاس یاغستان سے سفیر آیا کہ امیر حبیب اللہ خاں قتل کر دیئے گئے ہیں اور ان کی جگہ امیر نصر اللہ خاں کی بجائے امیر امان اللہ خاں کابل کے بادشاہ بن بیٹھے ہیں اور انھوں نے انگریزی

حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ مُلّا شیر اور قبائل شوریٰ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ وہ کیا کریں۔ میں نے بلا تامل کہا کہ امیر امان اللہ خاں کی ہر ممکن امداد کرو۔ چناں چہ ہماری تنظیم نے امان اللہ خاں کو بچالیا اور نادر شاہ مرحوم کو فاتح عقل بنا دیا۔ یہ قصّہ تو بہت طولانی ہے اور انشاءاللہ علیحدہ فرصت میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالوں گا۔ مارشل لا کی شدید پابندیوں کے باوجود وہ قاصد مجھ تک پہنچا بھی اور واپس چلا بھی گیا۔

مجھے اُسی وقت اطمینان بھی ہو گیا کہ اب مارشل لا اُٹھ جائے گا۔ چناں چہ اس کے شاید تین دن بعد سر مائیکل اوڈوائر کے دو خاص آدمی میرے پاس آئے اور کہا کہ سر مائیکل نے آپ کو یاد کیا ہے۔

جب میں لاہور پہنچا تو سر مائیکل کے پرائیویٹ سکرٹیری سر جان فرنچ نے مجھ سے افغانستان کی فوجوں کے متعلق سوالات کرنے شروع کئے۔ میں نے کہا کہ افغانستان کا بچہ بچہ سپاہی ہے۔ کوئی ایک گھنٹہ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد اُنھوں نے کہا کہ افغانستان نے کمال نادانی سے ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے اور سر مائیکل کی خواہش ہے کہ آپ ہمارے سفیر بن کر افغانستان جائیں تاکہ آپ قبائلیوں کو جنگ سے باز رکھ سکیں۔ سرکار انگریزی آپ کو تین ہزار روپیہ ماہوار علاوہ تمام اخراجات کے دے گی اور اگر آپ کامیاب واپس آئے تو بہت بڑی جاگیر اور سکرٹری شپ آپ کو بطور انعام دی جائے گی۔ میں نے بہت سختی سے انکار کیا۔ اس پر مجھے سر مائیکل کے حضور میں پیش کیا گیا۔ سر جان فرنچ نے کچھ ان کے کان میں میرے متعلق کہا۔ اس پر سر مائیکل کا چہرہ غصّہ سے سرخ ہو گیا اور وہ لال بھبھوکا ہو کر بولے۔

"کیا تم انکار کرتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم ابھی تک سرکار کے دشمنوں

سے تنخواہ لیتے ہو۔ یاد رکھو تم اور تمہاری آنے والی نسلیں روئیں گی۔

میں نے بہت تحمل سے کہا کہ "سر مائیکل آپ اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسی بات آپ کو زیب نہیں دیتی۔"

اس کے بعد مجھ میں اور ان میں خاصی سخت کلامی ہوئی اور سر مائیکل نے آگ بگولا ہو کر کہا کہ انھیں میرے سامنے سے نکال دو۔ خیر مجھے سر جان فرنچ اپنے ساتھ لے گئے اور ایک سیکنڈ کلاس کا پاس دیا اور سرکاری موٹر میں مجھے ریلوے سٹیشن پر پہنچا دیا۔

قصور میں میں دوسرے دن والد صاحب قبلہ سے جیل میں ملنے گیا تو میں نے ان سے کہا کہ انشاء اللہ آپ سب رہا ہو جائیں گے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ دوسرے ہی دن سٹیشن سے وہ پھانسیاں غائب ہو گئیں اور مارشل لا قریباً ختم ہو گیا۔ انگریز سپاہی تمام سرحد کی طرف بھیج دیئے گئے۔

اس کے دو ایک دن بعد مجھے پھر لاہور طلب کیا گیا اور پھر سر مائیکل نے مجھ سے پوچھا کہ میں افغانستان میں سفیر کی حیثیت سے جانا چاہتا ہوں یا نہیں۔ ان کی دھمکیوں اور میرے انکار پر مجھے پھر قصور پہنچا دیا گیا۔ لیکن اس کے دوسرے ہی دن شیخ اصغر علی مرحوم آئی، سی، ایس، اور سر جان فرنچ دونوں قصور آئے شیخ اصغر علی ان دنوں پولیس کے افسر اعلیٰ تھے اور بعد میں کمشنر لاہور بنائے گئے۔ یہ دونوں افسر سیدھے جیل گئے اور انہوں نے گورنمنٹ کے احکام سے والد صاحب قبلہ مرحوم و مغفور کو رہا کیا اور ان سے بہت معافی مانگی کہ آپ کو بلا وجہ قید و بند کی مصیبت برداشت کرنا پڑی۔ اس کے بعد انھیں موٹر میں سوار کرا کر ہمارے گھر آئے۔ اور مجھ سے والد صاحب کے سامنے کہا کہ ہم اب آخری مرتبہ سر مائیکل کی آفرے کر آئے ہیں۔ شیخ اصغر علی چوں کہ والد صاحب کے بہت بے تکلف

دوست تھے (خاص طور پر بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے بہت زور دیا مگر میں اپنے انکار پر قائم رہا اور وہ دونوں خفا ہو کر چلے گئے اور اس طرح یہ ڈراما ختم ہو گیا۔

یہاں بطور تتمہ اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ جب امیر امان اللہ خاں نے فتح کی خوشی میں تمغے تقسیم کئے تو تین اعلیٰ ترین تمغے نادر شاہ غازی اور ملا بشیر اور راقم الحروف کو مرحمت ہوئے۔ وہ تمغہ ان خدمات کے صلہ میں تھا جو ہماری جماعت نے افغانستان کے استحکام کے لئے کی تھیں۔

ہندستان میں واپسی کے بعد میری مساعی ختم نہیں ہو گئیں بلکہ انھوں نے ایک نئی راہ نکالی۔ اور اس کی داستان بہت طویل ہے، انشاء اللہ پھر کسی وقت اسے بھی قلمبند کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت عربی کا ایک شعر یاد آرہا ہے وہ سپرد قلم کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

لا تقنطوا الدر ینثر عقدہ

لیعود احسن بالنظام واجملا

"مایوس مت ہو کیوں کہ ہار کے موتی پریشان کئے جاتے ہیں تاکہ انھیں ایک نئے اور خوبصورت دھاگے میں پرو دیا جائے۔"

اسلامی خلافت کے قیام کے متعلق میرے عقائد اب بھی وہی ہیں بلکہ اور زیادہ منجھ گئے ہیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

اسٹوڈنٹس انگلش اُردو ڈکشنری

یہ اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد اعزازی انجمن ترقی اُردو کا اختصار ہے۔ لیکن باوجود اختصار کے بہمہ وجوہ مکمّل اور جامع ہے۔ بڑی کتاب میں سے صرف وہ الفاظ جو قدیم اور متروک ہیں اور ادب میں مستعمل نہیں یا ایسی اصطلاحات جو کسی خاص فن سے مخصوص ہیں، اور عام طور پر ادب میں کام نہیں آتیں، خارج کر دی گئی ہیں بعض الفاظ کے معنی میں جو غیر ضروری مترادف تھے وہ بھی نکال دیئے گئے ہیں۔ اس سے لغت کی جامعیت اور خوبی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ایک اعتبار سے یہ لغت زیادہ صحیح اور مکمل ہے۔ کیونکہ بڑی کتاب کے بعد تیار ہوئی ہے اور اس میں جو کہیں کہیں خامیاں رہ گئیں تھیں وہ اس میں درست کر دی گئیں اور بعض الفاظ کے خاص معنی جو بعد میں معلوم ہوئے اضافہ کر دیئے گئے۔

کالجوں اور مدارس کے طالب علموں، عام پڑھنے والوں نیز مترجموں کے لیئے یہ ڈکشنری بہت کارآمد ثابت ہو گی۔ کیونکہ اب تک کوئی انگریزی اُردو ڈکشنری اس جامعیت اور صحت کے ساتھ ہماری کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت ۱۵۰۰ صفحات قیمت صرف ساڑھے بارہ روپے۔

ملنے کا پتہ

منیجر انجمن ترقی اُردو پاکستان، اُردو روڈ۔ کراچی ۱!

غزل

اور

مطالعۂ غزل

اِس کتاب کا موضوع غزل ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غزل کے ارتقا، اس کی اہمیت اس کے جمالیاتی پہلو، جدید رجحانات اور اس کے مستقبل غرض اس کے ہر پہلو پر بہت تفصیلی اور بصیرت افروز بحث کی ہے اور غزل سے متعلق تمام مسائل کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ چند مضامین غزل کے اصول کی تنقید میں ہیں اور چند غزل [illegible] مع کتاب جس میں غزل پر اس تفصیل سے بحث [illegible] لکھی گئی۔

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو، اردو روڈ۔ کراچی ۱ پاکستان

انجمن پریس

لارنس روڈ۔ کراچی